Phone: 7500

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

کنونشن نمبر

مئی و جون 1961ء

قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

بدلِ اشتراک
ہندوپاکستان سے سالانہ۔ آٹھ روپے
غیر ممالک سے سالانہ۔ ۱۶ شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہند و پاکستان سے
۷۵ نئے پیسے

ٹیلیفون نمبر:۔ ۷۵۰۰
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

جلد ۱۴ | مئی۔ جون سنہ ۱۹۶۱ء | نمبر ۵-۶

فہرستِ مضامین

لمعات	۲
روئیداد کنونشن (محترم صفدر سلیمی صاحب)	۹
استقبالیہ (چوہدری عبدالرحمٰن صاحب)	۳۷
رپورٹ (مولانا عبدالرب صاحب ناظم ادارہ)	۴۰
رپورٹ میزان پبلیکیشنز (چوہدری عبدالرحمٰن صاحب)	۴۵
مژدۂ صبح (محترم پرویز صاحب)	۴۹
فردوسِ گم گشتہ (محترم پرویز صاحب)	۵۹
بزمِ خواتین	۸۱
ڈاکٹر زاہدہ دزانی۔ پروفیسر شمیم انور	
پروفیسر زاہدہ منظور۔ ثریا عندلیب۔ سکندرہ بیگم ریاض۔ پروفیسر سعیدہ اختر۔ پروفیسر حمیدہ جہاں خواجہ	
باب المراسلات	۱۱۳
حقائق و عبر	۱۱۷
نقد و نظر	۱۱۹
دھتکارے ہوئے انسان (محترم عنایت اللہ صاحب)	۱۲۱
حضرت عمرؓ کا طریقِ شوریٰ (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	۱۳۷
مفہوم القرآن (محترم پرویز صاحب)	۱۴۵
ضمیمہ تقریر انگریزی (پروفیسر شمیم انور صاحب)	۱۶۱

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

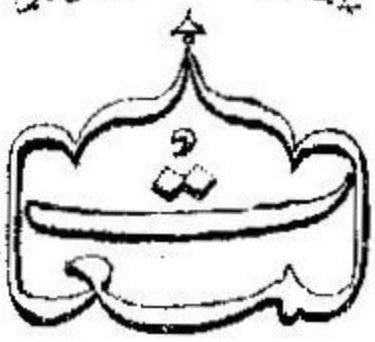

لمعات

بارہا گفتہ ام و، بارِ دگر می گویم

ہمارے گھروں میں ہر صبح، پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ آج کیا پکے گا؟ ــــــــ یہ سوال ہر روز دُہرایا جاتا ہے، اور ساری عمر دُہرایا جاتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہم اس سے کبھی نہیں اُکتاتے۔ ایسا عام حالات میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص (خدانکردہ) بیمار ہو جائے تو اس سوال کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے ــــــــ صبح کے ناشتے میں کیا دیا جائیگا دوپہر کے کھانے میں کیا ہوگا۔ رات کے کھانے کی کیا کیفیت ہوگی۔ کس کس چیز سے پرہیز کیا جائے گا۔ کون کون سی چیز زیادہ دی جائے گی، اور کب دی جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ سوالات بار بار دہرائے جاتے ہیں اور ہم ان کی تکرار سے کبھی نہیں گھبراتے، نہ ہی ان سے ہمارے ماتھے پر شکن پڑتے ہیں ــــــــ بجز ان کے جن کا مزاج چڑچڑا ہو گیا ہو اور وہ معاملات کو غور و فکر سے سلجھانے کی صلاحیت کھو بیٹھے ہوں، یا شدت جذبات سے جن میں قوت برداشت نہ رہی ہو۔

افراد سے آگے بڑھئے تو یہ مسئلہ اجتماعی اور قومی اہمیت حاصل کر لیتا ہے۔ حکومت کو سب سے پہلے یہ فکر دامن گیر ہوتی ہے کہ افرادِ مملکت کے لئے خوراک کا انتظام کیا کیا جائے۔ غلے کی کمی کو کیسے پورا کیا جائے۔ غذا کس قسم کی ہونی چاہیئے اور وہ کہاں سے آئے گی۔ ملک کی حفاظت کے مسئلہ کے بعد مملکت کے بجٹ میں سب سے پہلی شق خوراک سے متعلق ہوتی ہے۔ اور ایسا ہونا بھی چاہیئے۔ زندگی کا دار و مدار خوراک پر ہے۔ اگر افرادِ مملکت زندہ نہ رہیں تو مملکت کیسے باقی رہ سکیگی ــــــــ اور اگر وہ باقی رہ بھی جائے تو اس کو بقا حاصل کیا ہوگی۔

لیکن اس مسئلہ کا تعلق، انسان کی طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) سے ہے۔ یہ وہ زندگی ہے جس میں حیوان اور انسان دونوں شامل ہیں۔ اس لئے اس زندگی کو حیوانی سطح زندگی (ANIMAL LIFE) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ زندگی، جس کا تعلق انسان کی "انسانیت" سے ہے اور جس میں کوئی اور ذی حیات شریک نہیں، اس سے آگے

شروع ہوتی ہے۔ وہ خصوصیت جس کی بنا پر "آدمی" انسان کہلاتا ہے، اسی سطح زندگی سے متعلق ہے۔ یہی زندگی اسکے لئے وجہِ شرف اور باعثِ تکریم ہے۔ اسی زندگی کی حفاظت اور نشوونما انسانی فریضہ ہے۔ حیوانی سطح زندگی مقصود بالذات نہیں۔ یہ وہ قالب ہے جس کے اندر انسانی زندگی نشوونما پاتی ہے۔ یہ وہ انڈے کا خول ہے جس کے اندر زندگی کی خوابیدہ ممکنات ایک جیتے جاگتے بچے کی شکل اختیار کرتی ہیں۔

اب ظاہر ہے کہ جب حیوانی زندگی جو انسانی زندگی کی نشوونما کا ذریعہ اور پیکر ہے، اس قدر اہمیت رکھتی ہے کہ اسے قائم رکھنے کیلئے ہم اپنی تمام توجہات صرف کر دیتے اور عملی ذرائع حرکت میں لاتے ہیں تو جو زندگی مقصود بالذات ہے، اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حیوانی زندگی کے تحفظ اور بقا کا ذریعہ خوراک ہے، لیکن جس چیز سے انسانی زندگی محفوظ رہتی اور آگے بڑھتی ہے وہ ہے ——— صحیح تعلیم۔ اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہم تعلیم کے مسئلہ کو کیوں بار بار سامنے لاتے ہیں، اور اس کی تکرار سے نہ اکتاتے ہیں، نہ گھبراتے۔ ہم اسے بار بار سامنے لائیں گے اور ایسا کرنے سے نہ اکتائیں گے نہ گھبرائیں گے۔ اس لئے کہ اسکا تعلق ہماری انسانی زندگی سے ہے۔ اور انسانی زندگی کی قیمت اور اہمیت کا ہمیں اندازہ ہے۔

ہماری حکومت نے، افرادِ مملکت کی فلاح و بہبود کے لئے، نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں جو کچھ کیا ہے اور جو کچھ کر رہی ہے، اس کے ہم معترف اور شکر گزار ہیں، لیکن جہاں تک تعلیم کا سوال ہے، ہماری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ جس طریق سے اسے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، حکومت کی حُسنِ نیت کے باوجود، اس سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو سکیں گے جن کے لئے یہ تمام جدوجہد کی جا رہی ہے۔ ان کوششوں کا رُخ، بالائی عمارت (SUPER - STRUCTURE) کی مرمت یا تزئین و آرائش کی طرف ہے۔ حالانکہ اصلی نقص بنیاد کا ہے، اور جب تک بنیاد نہیں بدلی جاتی، بالائی عمارت میں ترمیم و تنسیخ، خاطر خواہ نتیجہ پیدا نہیں کر سکتی۔ مسئلہ تعلیم کی بنیاد ہوتا ہے وہ مقصد جس کے لئے تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم ہزار فلسفیانہ گفتگو کریں، اس حقیقت کو چھپایا نہیں جا سکتا کہ اس وقت تک ہمارے سامنے تعلیم کا مقصد وہی ہے جس کے لئے انگریز نے یہاں تعلیم کا سلسلہ رائج کیا تھا۔ وہ تعلیم اس لئے دیتے تھے کہ لوگوں کو ملازمت کے لئے تیار کریں، اور لوگ تعلیم اس لئے حاصل کرتے تھے کہ انہیں ملازمت مل جائے۔ یہی مقصد اس وقت تک ہمارے سامنے ہے۔ آپ طالب علموں سے پوچھیے یا ان کے والدین سے۔ آپ کو اس سوال کا جواب ایک ہی ملیگا۔ اور وہ یہ کہ تعلیم سے ان کا مقصد ہے حصولِ معاش ——— خواہ وہ ملازمت کی شکل میں ہو یا کاروبار کو فروغ دینے کے رنگ میں ——— طالب علم کا منتہائے نگاہ امتحان پاس کرنا ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ حصولِ ملازمت کی ضروری شرط ہے۔ کامیاب طالب علم وہ ہے جو ہر سال امتحان پاس کرتا جائے، اور قابلِ صد افتخار و ہزار ستائش وہ جو امتحان میں اچھی پوزیشن حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مقاصد حیوانی سطح زندگی سے متعلق ہیں۔ انسانی سطح کا اس میں نام تک نہیں آتا۔ یعنی دیکھا یہ جاتا ہے کہ طالب علم روٹی کمانے

سکے قابل ہو گیا ہے یا نہیں۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ وہ انسان بننے کے قابل بھی ہو گیا ہے یا نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تعلیم، حصولِ معاش میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے ——— اور اسے ہونا بھی چاہیئے ——— لیکن ہم جس بات کا رونا رو رہے ہیں وہ یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد معاش حاصل کرنا بن چکا ہے، انسان بننا نہیں۔ ہماری تعلیم، تعلیم نہیں۔ محض ایک ہنر ہے۔ ناخواندہ مستری کہلاتا ہے، تعلیم یافتہ، انجینیر۔ فرق دونوں میں یہ ہے کہ وہ سو روپیہ ماہوار کماتا ہے، یہ ہزار روپیہ۔ جہاں تک انسان ہونے کا تعلق ہے (جرأت عرض معاف) اکثر صورتوں میں وہ مستری اس انجینیر سے چند قدم آگے نظر آئے گا۔ یہ مقصد ہے تعلیم حاصل کرنے والوں کا۔ باقی رہے تعلیم دینے والے، تو انکے پیشِ نظر مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں اچھے انجینیر پیدا ہوں کیونکہ ملک کو انجینیروں کی ضرورت ہے۔ انکے سامنے یہ مقصد نہیں ہوتا کہ ہمارے پاس ایسے انجینیر پیدا ہوں جو اچھے انسان بھی ہوں۔ یہ ہے بنیادی نقص ہماری تعلیم کا ——— اس کا مقصد انسان سازی نہیں، ہنر آموزی ہے۔

ہنر آموزی کے لئے صرف اتنا کافی ہوتا ہے کہ طالبِ علم کی معلومات (INFORMATION) میں اضافہ کر دیا جائے۔ اس کا "علم" (KNOWLEDGE) بڑھا دیا جائے۔ لیکن تعلیم (EDUCATION) سے مفہوم یہ ہوتا ہے کہ طالبِ علم کو یہ سکھایا جائے کہ وہ اپنے "علم" (KNOWLEDGE) کو استعمال کس مقصد کے لئے کرے۔ ہماری تعلیم کے تین مدارج (STAGES) ہیں۔ پہلا درجہ اسکول کا۔ اس میں نصابِ تعلیم اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے؟[1]

اس کے بعد کالج کی اسٹیج آتی ہے۔ اس میں، ابتدائی معلومات کے ساتھ "آرٹ اور کلچر" میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ اس سے، بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ نوجوان طالبِ علموں کے دل میں بار بار یہ سوالات پیدا ہوں کہ

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں ———— غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟ ———— نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

اور آخری درجہ ہے فلسفیانہ غوامض وغیرہ کی ریسرچ کا جس میں اس قسم کے مباحث، موضوعِ تحقیق بنتے ہیں کہ

جب کہ تجھ بن کوئی نہیں موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد، یہ نوجوان، تلاشِ روزگار کے چکر میں پھنس جاتا ہے۔ شروع شروع میں، چونکہ توقعات بڑی بلند اور آرزوئیں بڑی تابناک ہوتی ہیں، اس لئے وہ اپنی متاع کو بڑا گراں بہا سمجھتا ہے اور کسی سے گر کر سودا کرتا نہیں

[1] - غالبؔ سے معذرت کے ساتھ۔

چاہتا۔ لیکن چند ہی دنوں کے بعد تلخ حقیقتیں اس کے سامنے بے نقاب ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ مختلف دفاتر کے دن بھر کے ناکام چکر کے بعد، شام کو واپس آتا ہے تو گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے کہ

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

تھوڑے سے اور ناکام تجارب کے بعد، وہ بیچارا سودے بازی سے گداگری پر اُتر آتا ہے اور ہر بڑی چوکھٹ پر یہ کہتا سنائی دیتا ہے کہ

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے

جو خوش قسمت ہوں، اُن کی جھولی میں ان صداؤں پر ٹکڑا پڑ جاتا ہے، باقیوں کے متعلق اربابِ بست وکشاد کچھ اس انداز سے سوچتے ہیں کہ

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

اور اسے بطورِ (UN - PAID APPRENTICE) رکھ لیا جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کی بیگار کے بعد، جب اُسے معاوضہ ملنا شروع ہو جاتا ہے تو وہ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہے کہ اس کی شانِ رزاقیت نے بڑا کرم کیا۔ اسی چکر میں وہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ ہے مقصد ہماری تعلیم کا۔ اکبرؔ کے الفاظ میں۔

بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی اور مر گئے

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے، حیوانی سطحِ زندگی سے بلند، انسانی سطحِ زندگی کا تصور ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ چنانچہ ہم تو ہم، دنیا کی مہذب ترین قومیں، جن کے سامنے حیوانی سطحِ زندگی کے تقاضوں سے بلند کوئی مقصد نہیں، ان کی حالت بھی ایسی ہی ہے ــــــ بلکہ اس سے بھی بدتر۔ (LEWIS MUMFORD) امریکہ کے متعلق لکھتا ہے۔

"ہم نے یہاں ایک نئی نسل پیدا کی ہے۔ عمدہ توانائی، خوبصورت جسم، لیکن دل بالکل خالی۔ وہ نسل جس کے نزدیک زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ یہ "مہذب وحشی" نوجوان، حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ میں کھڑے آفتابی غسل لے رہے ہیں۔ کبھی بیکار جنسی میلان کے تحرک سے ناچنے لگ جاتے ہیں۔ یہ اپنے لباس کے بارے میں بہت محتاط ہیں۔ لیکن یہ احتیاط محض فیشن کی پابندی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یہ لوگ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، شادی کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں ــــــ ایسی زندگی جی کر، جو اگر کامیاب ہے تو حیوانی نشاط انگیزی کی، اور اگر ناکام ہے تو حسد، خوف اور پریشانی کی ــــــ حیوانی سطح اور حیوانی تسکین کے علاوہ، انہیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے۔ انہیں ان حیوانی لذات سے محروم کر دیجئے تو ان کے لئے جینا وبالِ دوش ہو جائے گا۔" (FAITH FOR LIVING)

یہی ہے وہ پود ـــــ بلکہ اس سے بھی گھٹیا قسم کی ـــــ جسے یہاں ہماری تعلیم پیدا کر رہی ہے ـــــ وہ پود کہ جو اگر ناکام ہے تو خود اپنے آپ سے تنگ ہے، اور اگر کامیاب ہے تو ان کے ہاتھوں معاشرہ تنگ ہے۔

جب ہم ان کے ہاتھوں زیادہ تنگ آجاتے ہیں تو سوچنے لگتے ہیں کہ ان کا علاج کیا کیا جائے؟ چنانچہ کچھ عرصہ پہلے، ہم نے اسی طرح سے سوچا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان خرابیوں کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں کیریکٹر نہیں۔ پھر سوچا گیا کہ ان میں کیریکٹر کیوں نہیں، تو اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ ہماری تعلیم میں مذہبی عنصر کی کمی ہے۔ اسے پورا کر دیا جائے تو قوم میں کیریکٹر پیدا ہو جائے گا۔ نصابِ تعلیم میں مذہبی عنصر کی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ سوچا گیا کہ طالب علموں کو قرآن کی آیات حفظ کرائی جائیں۔ احادیثِ مقدسہ یاد کرائی جائیں۔ اسلام (یعنی مسلمانوں) کی تاریخ پڑھائی جائے۔ دینیات کے مسائل سمجھائے جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

آپ غور کیجئے کہ یہ "تعلیم" ہے یا وہی چیز ہے جسے ہم نے شروع میں معلومات (INFORMATION) میں اضافہ کرنے سے تعبیر کیا ہے؟ صاف نظر آجائے گا کہ یہ ایجوکیشن نہیں معلومات افزائی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا اس قسم کی معلومات بہم پہنچانے سے، طالب علموں میں وہ کیریکٹر پیدا ہو جائے گا جس کے لئے ہم نے یہ طریق تجویز کیا تھا؟ اس کے لئے ہم ایک عام بات سامنے لانا چاہتے ہیں ـــــ ہمارا روئے سخن خاص افراد یا کسی خاص گروہ کی طرف نہیں ـــــ آپ ان طالب علموں کو مذہبی معلومات کا کچھ حصہ ہی بہم پہنچا سکیں گے۔ انھیں تمام تر معلومات کا ماہر نہیں بنا سکیں گے۔ ان کے برعکس، آپ (ساری دنیا پر) نگاہ ڈالئے اور ان لوگوں کو دیکھئے جنھوں نے ان معلومات کو مکمل طور پر حاصل کر رکھا ہے۔ کیا آپ کو ان لوگوں میں وہ کیریکٹر ملتا ہے جسے پیدا کرنے کے لئے آپ اپنے نصابِ تعلیم میں یہ تبدیلی کرنا چاہتے ہیں؟ اس سے آپ یہ نہ سمجھ لیجئے کہ ہم "مذہبی تعلیم" کے خلاف ہیں ـــــ ہمارا یہ ایمان ہے کہ مسلمانوں ہی کی نہیں، بلکہ ساری دنیا کی خرابیوں کا علاج "دین کی تعلیم" میں ہے۔ لیکن "دین کی تعلیم" اور "مذہبی معلومات" میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ دین کی تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ طالب علموں کے ذہن نشین کرایا جائے کہ

(۱)۔ حیوانی زندگی اور انسانی زندگی میں فرق کیا ہے۔

(۲)۔ انسانی زندگی کا مقصود (SELF-DEVELOPMENT) یعنی انسانی ذات کی نشوونما ہے۔

(۳)۔ انسانی ذات کی نشوونما اُن مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہوتی ہے، جو خدا کی طرف سے بذریعۂ وحی ملتی ہیں اور جو اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔

(۴)۔ یہ سمجھایا جائے کہ عقلِ انسانی ان اقدار کو کیوں وضع نہیں کر سکتی اور اس کے لئے وحی کی راہ نمائی کی کیوں ضرورت ہے۔

(۵)۔ انہیں بتایا جائے کہ ان اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان، فطرت کی تمام قوتوں کو مسخر کرے اور ان کے ماحصل کو انہی اقدار کے مطابق عالمگیر انسانیت کی فلاح و بہبود کیلئے صرف کرے۔

(۶)۔ انہیں ان اقدار کی تفصیل بتائی جائے اور سمجھایا جائے کہ جو نظام ان اقدار کی حدود کے مطابق متشکل ہوگا، وہ کس طرح دنیا کے تمام نظام ہائے تہذیب و سیاست و معاشرت و معیشت کے مقابلہ میں، انسانیت کے لئے زیادہ نفع رسانی کا موجب ہوگا۔

(۷)۔ انہیں بتایا جائے کہ جب یہ نظام مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے مقدس ہاتھوں قائم ہوا تھا تو اس کے انسانیت ساز نتائج سے حسینِ کائنات میں کس قدر نکھار پیدا ہو گیا تھا۔

(۸)۔ انہیں بتایا جائے کہ انسانی ذات پر ایمان، اور اس کی نشو و نما پر یقین کے معنی یہ ہیں کہ یہ سمجھا جائے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں، بلکہ یہ مرنے کے بعد مسلسل آگے بڑھتی رہے (ب) انسان کا ہر عمل حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات بھی اپنا نتیجہ مرتب کرتے رہتے ہیں۔ ہر شخص کو اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتنا ہوگا۔ اس سے کسی کو کسی حالت میں بھی مفر نہیں ہو سکتا۔ خدا کا قانونِ مکافات اٹل ہے۔

(۹)۔ طالب علموں کو یہ بنیادی حقائق، علم کی اس سطح کی روشنی میں علیٰ وجہ البصیرت سمجھائے جائیں جس تک ذہنِ انسانی اس وقت تک پہنچ سکا ہے۔ اس طرح انہیں ان کی صداقت کے متعلق (CONVINCE) کرایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ اس قسم کی (CONVICTION) کو جس میں انسان کا قلب و دماغ پوری طرح مطمئن ہو جائے، ایمان کہتے ہیں۔

(۱۰)۔ اور پھر انہیں بتایا جائے کہ پاکستان اس لئے بنایا گیا تھا کہ یہاں وہ نظام قائم کیا جائے جو قرآن کی مستقل اقدار کا آئینہ دار ہو۔ اور یہ ہے وہ نظام جس کے چلانے کے لئے تمہیں تیار کیا جا رہا ہے۔ یہ وہ نظام ہے جس میں ملوکیت کا استبداد، سرمایہ داری کی خون آشامی اور مذہبی پیشوائیت کی اوہام پرستی کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس میں نہ کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم رہتا ہے اور نہ ہی کوئی کسی کے خلاف کسی قسم کی زیادتی کر سکتا ہے۔ اس میں کسی کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ مستقل اقدار میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکے۔ ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، اُمت اپنے اور انسانیت کے مسائل کا حل، اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے دریافت کرتی ہے۔

(۱۱)۔ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ اس تعلیم کو کتابوں تک ہی محدود نہ رکھا جائے۔ طالب علموں کو یہ بھی بتایا جائے کہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں، ان اقدار و قوانین کا عملاً اعلان کس طرح ہوگا۔ اس میں بھی صرف "بتلانے" پر اکتفا نہ کیا جائے، بلکہ دیکھا جائے کہ وہ اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس پر کس حد تک کاربند رہتے ہیں۔ اس چیز کا ریکارڈ رکھا جائے اور امتحان کے وقت (کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ کرتے وقت) اسے خاص اہمیت دی جائے تعلیم کے معنی ہی یہ ہیں کہ وہ زندگی کے مختلف مظاہر میں ہماری راہ نمائی کرے۔ ہمیں اس حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ ہم نے اپنے نوجوان طالب علموں کو "پڑھانا" ہی نہیں، انہیں کچھ "بنانا" بھی ہے۔ اور

"بنانے" کا یہی طریقہ ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ امتحان کا موجودہ طریقہ جس میں ممتحن کو طالب علم کی زندگی' نفسیات' خیالات' رجحانات کی کوئی واقفیت نہیں ہوتی' اور اس کا واسطہ صرف اُس تحریر سے ہوتا ہے جو پرچوں میں اس کے سامنے آتی ہے' بڑا ناقص ہے۔ لیکن اس کی اصلاح چونکہ بہت بڑی تبدیلی کی متقاضی ہے' اس لئے ہم سردست اس پر زور نہیں دیتے ——— اسے بتدریج اختیار کیا جا سکتا ہے ——— اس وقت ہم اتنی بنیادی تبدیلی ضروری سمجھتے ہیں کہ طالب علم کے متعلق یہی نہ دیکھا جائے کہ اُس نے کیا پڑھا ہے۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ وہ کیا بنا ہے۔ اس وقت' طالب علم دماغ کو "تھرماس بوتل" سمجھا جاتا ہے' جس میں علم (یعنی معلومات) کا ذخیرہ جمع ہوتا رہتا ہے' اور وہ انھیں' عند الضرورت' جوں کا توں نکال کر باہر رکھ دیتا ہے۔ اس قسم کا علم' تعمیر سیرت میں کسی کام نہیں آ سکتا۔ طالب علم کے دل و دماغ کو زرخیز زمین سمجھنا چاہیئے کہ اس میں جو کچھ ڈالا جائے وہ ساتھ کے ساتھ بڑھتا پھولتا چلا جائے اور آخر الامر اس کے برگ و بار' اس تمام پروگرام کی کامیابی کی زندہ شہادت بنیں۔ اس ضمن میں اس اصول کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ مُردہ تصورات (جنھیں پروفیسر وھائٹ ہیڈ "INERT IDEAS" کہکر پکارتا ہے) انسانی نشو و نما' کیلئے کبھی حیات بخش ثابت نہیں ہو سکتے۔ "مردہ تصورات" سے مراد ایسے تصورات ہیں جنھیں عملی زندگی پر منطبق نہ کیا جائے۔ طالب علم کا دل و دماغ (MIND) جامد پتھر کا نہیں ہوتا' وہ زندہ ہوتا ہے اور ہر وقت ان اسباب و ذرائع کی تلاش میں رہتا ہے جو اُسے متحرک رکھ سکیں۔ اور نشو و نما دے سکیں۔ جب آپ اُس کے (MIND) کو جامد تصورات سے بھر دیتے ہیں تو وہ اپنی زندگی اور نشو و نما کے لئے دوسرے مقامات سے اسباب و ذرائع تلاش کرتا ہے ——— یہ اسباب و ذرائع جہاں سے ملیں' اور جیسے ملیں' وہ لیتا چلا جاتا ہے ——— وہ جامد تصورات' امتحان پاس کرنے اور معاش حاصل کرنے کے کام آتے ہیں' اور اس کی سیرت ان اسباب و ذرائع سے مرتّب ہوتی ہے جسے وہ دوسرے مقامات سے حاصل کرتا ہے۔ اور یہی اصل بنیاد ہے ان تمام خرابیوں کی جن کا رونا ہم ہر روز روتے رہتے ہیں ——— کہ ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ دن بدن بگڑتا چلا جا رہا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ مستقل اقدارِ انسانیت کی تعلیم سے ان کے ذہن کی تربیت کی جائے اور انہیں ساتھ کے ساتھ عملی زندگی پر منطبق کر کے اُن کی تعمیر سیرت کی جائے۔

یہ ہوگا مختصر الفاظ میں' اس تعلیم کا سلیبس (SYLLABUS) جسے ہم نے "دینی تعلیم" سے تعبیر کیا ہے۔ ہم نے اس چیز کو آج پہلی دفعہ پیش نہیں کیا۔ اسے ہم شروع سے پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔ مقامِ مسرت و اطمینان ہے کہ ہماری یہ آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوئی۔ اس کی تائید ان گوشوں سے ہونی شروع ہو گئی ہے جو ہمارے معاشرہ میں بڑا وزن رکھتے ہیں۔ مثلاً اگلے دنوں' مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس' محترم کیانی صاحب نے گورنمنٹ کالج لائل پور کے کونوکیشن ایڈریس میں فرمایا۔

(بقیہ صفحہ ۱۲۴ پر دیکھئے)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

روئیداد

طلوعِ اسلام کنونشن لاہور

(پانچواں سالانہ اجتماع)

★ منعقدہ ۷، ۸، ۹ اپریل ۱۹۶۱ء ★

❁ ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار ❁

محترم صفدر سلیمی صاحب کے قلم سے

حرفِ آغاز گردشِ لیل و نہار کا طویل و شدید انتظار بالآخر ختم ہوا۔ چھ اپریل کی صبحِ بہار ننھی ننھی سفید بدلیوں کے ہجوم میں، اپنے رخِ کیف بار سے نقاب اُلٹ رہی ہے۔ لالہ و گل کی رعنائیاں جشنِ مسرت کے جھولے جھول رہی ہیں۔ فصلِ بہار کی ان شادابیوں میں کنونشن ہاؤس (شالامار ٹاؤن) کی عنبریں فضاؤں میں جلنے پہچلنے کاروانِ شوق کے خیر مقدم کا خمار چھایا ہوا ہے۔ کس قدر سہانے ہیں فصلِ بہار کے یہ شام و سحر!

عروسِ صبح نے لی ہے مچل کے انگڑائی

صبا کی نرمیٔ رفتار ہے نشاط انگیز

ہاں! صبحِ چمن کی اِن جاں نوازیوں میں کنونشن کمیٹی کے ایثار پیشہ رضا کار، ایک عالم آرا مستقبل کی حسین امنگیں اور دل کش ارمان سینوں میں لئے کنونشن کے وسیع انتظامات کی حسنِ کارانہ تکمیل میں سرگرمِ کار ہیں۔ اور نور و نکہت کی اِن سرمستیوں میں جھومتے ہوئے سبزہ زاروں کی بے زبانی، زبانِ حال سے گنگنا رہی ہے کہ

چمن میں یہ کون آرہا ہے، تمام موسم بدل رہا ہے

موسمِ بہار کا آفتاب، سُہانی بدلیوں سے آنکھ مچولی کھیلتا آہستہ آہستہ نصف النہار کی طرف بڑھ رہا ہے، اور اس کی

دھیمی دھیمی رفتار کے ساتھ کنونشن ہاؤس کے مختلف گوشوں میں ترتیب و تزئین کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ کیمپ کمانڈر چوہدری نصراللہ خاں اور نائب کمانڈر محترم عبدالحئی اپنے رضا کاروں کی رفاقت سے ہر گوشۂ تعمیر میں امکان کی آخری حد تک شایانِ شانِ حُسن و زیبائی کا نکھار پیدا کئے جا رہے ہیں۔ خلوص و ایثار اور تحسینِ اخلاق کے یہ بلند کردار پیکر، قرآنی تحریک کے اس مختصر سے نشیمن کی تعمیر میں اس لازوال یقین و اعتماد سے منہمک ہیں کہ یہ چھوٹی سی بستی ایک دن پورے انسانی نظام کو اپنی آغوشِ رحمت میں لے لیگی ——— یقیناً وہ مبارک و مسعود دن آئے گا جب اس فضا میں پروان چڑھتی ہوئی نظریات و تصورات کی منظم کوششیں نوعِ انسانی کے لئے نشانِ منزل قرار پا جائیں گی۔

ہمصفیرانِ چمن کی آمد آمد

ایک طرف تعمیر و تزئین کا یہ سلسلہ جاری ہے اور دوسری طرف سالہا سال سے مانوس احباب، دور و دراز فاصلوں سے اس مرکزِ امید کا رُخ کئے آ رہے ہیں۔ بادِ صبا کی شمیمِ جانفزا انہیں خوش آمدید کہتے ہوئے یہ پیام سنا رہی ہے کہ

آبِ کوثر سے آنکھ کو دھو لو
میکدہ پھر قریب آیا ہے

اور واقعی یہیں سے میکدہ کے نشان سامنے نظر آنے لگتے ہیں کتنے ہی حسین تصورات ان کے ذہن میں یہاں پہنچکر جگمگا اُٹھتے ہیں۔ یہی خمکدۂ فکرِ قرآنی ہے جہاں بادہ نوشوں کی مجلسیں از سرِ نو آراستہ ہوں گی۔ جہاں پیرِ مغاں کی بارگاہِ جذب و مستی سے نئے جام و سبو گردش میں آئیں گے۔ فکر و بصیرت کے کاشانوں میں سُرور انگیز کیف برسیگا۔ زندگی کے آبگینے نئے ولولہ ہائے شوق سے لبریز ہوں گے۔ نگاہِ عشق و مستی نئے شاہدِ مقصود سے مالا مال ہوگی۔ عزائم کو ایک نئی دعوتِ انقلاب ملیگی اور ولولہ ہائے شوق کے نصیب پھر جاگ اُٹھیں گے۔

قرآنی تصورات کے یہ طائرانِ پیش رس اپنے سالانہ معمول کی وابستگی سے اب اس فضا کو اپنے لئے مانوس ہی نہیں پاتے، بلکہ اقبالؒ کے ہنگامہ خیز لاہور کا یہ دور و دراز اور پُرسکون گوشہ اب ان کی آرزوؤں کا گہوارہ اور قلب و نگاہ کی شادابیوں کا مرکز و محور قرار پا چکا ہے۔ کنونشن ہاؤس کے ایک ایک ذرہ کی تابانی اور ایک ایک پھول کی مسکراہٹ میں انہیں مستقبل کے فکری و نظری انقلاب کی وہ بساط بچھتی نظر آ رہی ہے جس پر فلسفہ و حکمت کے بہارستان رشک کریں گے، اور جس کے لہلہاتے ہوئے سرو سمن اس جنتِ ارضی کے آئینہ دار قرار پائیں گے، جو قرآن کے زندہ و پائندہ تصورات کی اساس پر انسانی زندگی میں قائم ہوتی ہے۔

یہ طائرانِ پیش رس سالہائے گذشتہ کی طرح اس فضا میں وارد ہو رہے ہیں۔ اور ان کی خلوص بھری ہم آغوشیوں میل ملاپ، سلام و پیام اور ربطِ باہمی سے ایک بار پھر وہ مسرت انگیز محفل آراستہ ہو رہی ہے جسے دیکھ دیکھ کر طلوعِ اسلام کی تحریک کے میرِ کارواں کا شبابِ رفتہ واپس لوٹ آتا ہے۔

نظم و ضبط کا سرچشمہ

کنونشن کی ہنگامہ آرائیوں کے حرفِ آغاز کے ساتھ ہی ہماری نگاہوں کے سامنے اس پیکرِ ایثار کی شخصیت اُبھر آتی ہے جسے بجا طور پر اس جنّتِ ارضی کا "رضوان" کہنا چاہیئے۔ ــــــ ضلع گوجرانوالہ کی بزموں کے ترجمان خواجہ محمد حسین، جن کے جوشِ عمل کے بغیر شاید ہماری کسی کنونشن میں بھی نظم و ضبط کی یہ دلکشائیاں نظر نہ آتیں ــــــ کنونشن ہاؤس کے بابِ عالی میں داخل ہوتے ہی ہر مہمان دفترِ استقبالیہ میں اس کلید بردارِ ایوانِ قرآنی سے روشناس ہوتا ہے ــــــ نہیں، بلکہ اُسے روشناس ہونا پڑتا ہے ــــــ اور یہاں سے آگے قدم بڑھانے کے لئے سب سے پہلے انہی کی وساطت سے ضابطہ کی تکمیل ہوتی ہے۔

کنونشن کی شبِ اوّل

افقِ مغرب میں غائب ہوتے ہوتے چھ اپریل کا آفتاب کنونشن ہاؤس کی فضا کو ہنگاموں اور قہقہوں سے بھرپور پا رہا تھا۔ مہمانوں اور نمائندوں کی بہت بڑی تعداد اس وقت تک کیمپ میں داخل ہو چکی تھی، اور میرِ کارواں کے انتظار میں سب کی نگاہیں بار بار بابِ عالی کی طرف اُٹھ رہی تھیں۔ غروبِ آفتاب کے تھوڑی دیر بعد جبکہ آسمان پر ستاروں کی جھلکیں شروع ہو چکی تھیں، وہ پنڈال میں داخل ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی منتشر لوگ چاروں طرف سے سمٹ کر صحنِ چمن میں مرکوز ہو گئے۔ آناً فاناً دفترِ استقبالیہ کے سامنے شائقینِ دید کا ایک جمگھٹا سا نظر آنے لگا۔ پرویز صاحب باری باری سب سے بغل گیر ہو رہے تھے ــــــ ستاروں نے اپنے ماہتاب کے گرد ہالہ سا بنا رکھا تھا ــــــ یہ وہی تھے جنہیں ایک سال قبل پرویز صاحب نے اشک آلود نگاہوں اور بھرّائی ہوئی آواز میں اس حسرتِ آرزو کی بیتابیوں میں رخصت کیا تھا کہ ؎

هزار بار برو صد هزار بار بیا

اور شمعِ قرآنی کے یہ پروانے آج پھر اس خضرِ راہ کو اپنے درمیان پا رہے تھے جس نے انہیں مدتوں کی گم گشتہ منزلوں کا سراغ دیا۔ وہ مسیحائے ملت آج انہیں پھر گلے لگا رہا تھا جس کی قرآنی فکر و بصیرت اور مسیحا نفسی انہیں حیاتِ نو کے جذب و مستی سے سرشار کر گئی۔ ان سب کے دلوں کی عقیدت بھری دھڑکنیں برملا کہہ رہی تھیں:

زندگی آپ کی نوازش ہے
ورنہ ہم لوگ مر گئے ہوتے

پرویز صاحب نے بالآخر سب سے رخصت ہو کر اپنی قیام گاہ کا رُخ کیا۔ لیکن اس یادگار تقریب پر دلِ بیقرار کو قرار کہاں! ساز و سامان کو ترتیب دے کر وہ بے تابانہ پھر باہر نکل آئے اور وہاں کیمپ کی طرف چل پڑے۔ وہ کیمپ جہاں احباب اب جدا جدا ٹکڑیوں میں تقسیم ہو کر قلب و نظر کی گہرائیوں سے وابستہ، زندگی کی مقدس ترین یادوں کو تازہ کر رہے تھے۔ اپنے محبوب خضرِ راہ کو سامنے پا کر سب کی نگاہیں وارفتہ وار ان کی راہ میں بچھ گئیں۔ مخصوص مسکراہٹ پرویز صاحب کے چہرے پر کھیل رہی تھی جب انہوں نے کیمپ میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور پھر چند دہقانی

نمائندوں کی ایک ٹولی کے قریب پہنچ کر ذرا رُک کے اور بیٹھ گئے۔ چند ہی لمحوں میں قرآنی فکر کی جوئے خموش حرکت میں آگئی اور اسکی موجیں ایک نغمۂ نوبہار کی دلکشی اختیار کر گئیں۔ ہمصفیرانِ چمن کا ایک خاموش اور طویل سلسلہ اب مفکرِ قرآن کے گرد پھیل چکا تھا اور ان کے قلب و نگاہ ان ضوفشانیوں سے منوّر ہو رہے تھے۔

کنونشن کی شبِ اوّل کی یہ نشاط انگیز محفلیں سکوتِ نیم شبی میں بھی جاری رہیں۔ سال بھر کی جدائی کے بعد قرآنی احباب کا اس طرح پھر جمع ہونا کس قدر حیرنشاط تھا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ رات گئے کچھ احباب طویل سفر کی تکان کے باعث اگر سو گئے تو تڑکے تڑکے بیدار ہو کر وہ پھر بزم آرائی کا سامان کرنے لگے اور اذانِ سحر کے وقت بھی زاہدِ شب زندہ دار کی طرح وہ اپنی ذکر و فکر کی انجمن سجائے ہوئے تھے اور سرمستیوں کی کیفیت یہ تھی کہ

صبح کا تارا پوچھ رہا تھا
کب تک دورِ جام رہے گا

پہلا اجلاس

احباب کی زندگی کی یہ شبِ یادگار آہستہ آہستہ اختتام پذیر ہوئی۔ ۷ر اپریل کا آفتاب طلوع ہوا۔ اور ناشتہ کے بعد ۹ بجے صبح کنونشن کا پہلا اجلاس شروع ہوا۔ فخرِ سرحد، خان جمال خان، اپنے مخصوص انداز میں مسکراہٹیں برساتے مسندِ صدارت پر تشریف لائے۔ حافظ عبدالمجید صاحب کی تلاوتِ کلامِ پاک اور خلیل مرزا کی نغمۂ اقبال سے سحر انگیزیوں کے بعد احباب کے تعارفِ باہمی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس سلسلۂ تعارف کا آغاز شیخ محمد شفیع نے احباب کراچی سے کیا۔ اور پھر احباب باری باری اس سلسلۂ دراز کی حسین کڑیاں بن کر سامنے آتے رہے ان میں پرانی بزموں کے جانے پہچانے احباب بھی تھے، اور نئی بزموں کے "تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل" بھی۔ محترم عبدالعلی (لاہور) اور محترم عبدالحیٔ (بورے والا) کی سعد بختیاں باعثِ رشک تھیں، جب خود میرِ کارواں مائیک پر بنفسِ نفیس تشریف لا کر اپنے مخصوص والہانہ انداز میں ان کے تعارف کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے۔ تعارف کے سلسلہ میں پرویز صاحب نے خلوص و ایثار کے ان پیکروں کو بلند بانگ الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ محترم عبدالحیٔ سالہا سال تک "عشقِ بلاخیز" کے جس "قافلۂ سخت جان" سے وابستہ رہے، اور پھر اس قافلہ کی عبرتناک حرماں نصیبیوں کے بعد انھوں نے جس جذبۂ جنوں سے طلوعِ اسلام کے بابِ عالی پہ دستک دی، اس کی ترجمانی کرتے ہوئے پرویز صاحب نے بے ساختگی کے عالم میں کہا کہ

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ
تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے!

محترم عبدالعلی کی پُر خلوص وفاداریوں اور فرماں پذیریوں پر فخر کرتے ہوئے میرِ کارواں نے فرمایا:-

"عبدالعلی کیا ملا۔ یوں سمجھئے کہ بوڑھے باپ کو ایسا عصائے پیری مل گیا جس پر اُسے بجا طور پر فخر

اور نا تر ہے"

"باباجی" کی بارگاہِ قلندری سے ایک خوش نصیب "سلیم بیٹے" کو اس سے بڑھ کر تحسین و تبریک کا اور کیا صلہ مل سکتا ہے؟ ——— عبدالعلی اس پر جس قدر بھی ناز کریں کم ہے۔

ہمصفیرانِ چمن کا یہ سلسلۂ تعارف دو گھنٹوں سے زیادہ عرصہ جاری رہا۔ احباب کی زندگی اور اس کے پس منظر کی نقاب کشائی ہوتی چلی گئی۔ انفرادی تعارف کی یہ مختلف کڑیاں، دراصل ایک اجتماعی داستانِ حیات کا سلسلۂ مربوط بنتی ہیں۔ قرآنی منزلِ مقصود کے مسافروں کی یہ آپ بیتیاں ایک کاروانِ بہار کی تاریخ قرار پائیں گی، اور گلہائے چمن کی یہ کہانی حقیقت میں ایک بہارستان کی تفصیل شمار ہوگی۔

پھولوں نے گلستاں سے تعارف کرا دیا
لفظوں نے داستاں سے تعارف کرا دیا

استقبالیہ اور رپورٹ

سلسلۂ تعارف کے اختتام پر حسبِ ضابطہ کارروائی کا سلسلہ آگے بڑھا، اور کنونشن کمیٹی کے صدر اور کنونشن ہاؤس کے معزز میزبان چوہدری عبدالرحمٰن صاحب نے اپنا استقبالیہ پیش کیا۔ احباب کا خیر مقدم کرتے ہوئے چوہدری صاحب نے واضح کیا کہ صدرِ کنونشن کمیٹی کی حیثیت سے چار سال قبل جو بھاری ذمہ داریاں ان کے سپرد کی گئی تھیں وہ ان سے شایانِ شان طور پر عہدہ برآ ہونے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے ہیں۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ وہ کنونشن کے انتظامات کو جس بلند معیار تک لے جانا چاہتے ہیں، تا حال اس میں کما حقہٗ کامیابی نہیں ہوئی۔ تاہم احباب کے تعاون سے وہ بہت جلد اس بلند معیار تک پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے۔ چوہدری صاحب نے رضاکاروں اور ان کے کمانڈر کا شکریہ ادا کیا، جن کی بدولت ان انتظامات اور احباب کی ضرورتوں کی تکمیل ہوتی ہے۔

صدرِ کنونشن کمیٹی نے، اس پر اظہارِ مسرت کیا کہ اس کنونشن میں" طاہرہ بہنیں" بھی پہلی بار شریک ہوئی ہیں۔ انہوں نے اس شرکت کو موجبِ ہزار سعادت و برکت قرار دیا۔ اور آخر میں دعا کی کہ جس مقدس اور عظیم مقصد کے لئے ملک کے طول و عرض سے احباب جمع ہوئے ہیں وہ حاصلِ تکمیل کو پہنچے۔ (چوہدری صاحب کا استقبالیہ اسی اشاعت میں دیکھئے)۔

صدرِ کنونشن کمیٹی کے استقبالیہ سے قبل، احباب کے تعارف کے دوران، محترم خان عبدالحکیم خان (نمائندہ بزمِ مردان) نے اپنے عزیز ترین رفیق اور قرآنی فکر کے ممتاز مبلغ، حاجی فقیر محمد خاں مرحوم کے ناگہانی سانحۂ ارتحال پر قرار دادِ تعزیت پیش کی۔ مرحوم حاجی فقیر محمد خاں ضلع مردان کے رؤسائے عظام میں سے تھے، لیکن اپنی اس خاندانی وجاہت کے باوجود وہ اپنی سیرت و کردار کو اس حد تک قرآنی سانچوں میں ڈھال چکے تھے کہ ان کی غریب دوستی، سادگی، اور دردمندی کی بدولت غرباء کے جھونپڑوں میں مسرتوں کے چراغ روشن رہتے تھے۔ رفقائے بزم سے تو ان کے روابط

اس قدر گہرے تھے کہ عیدین کی تقریبات پر وہ ایک ایک کے گھر پہنچ کر ہدیۂ تہنیت و تبریک پیش کرتے تھے۔ طلوعِ اسلام کی کنونشن میں وہ بالالتزام شریک ہوتے رہے۔ اور ان کی ظرافتِ طبع اور زندہ دلی اس سالانہ تقریب پر ایک باغ و بہار شخصیت کی طرح چھائی رہی۔ چنانچہ صاحب عبدالعلیم خاں صاحب نے قرار دادِ تعزیت پیش کرتے ہوئے بڑے حسرت ناک انداز میں کہا کہ

"میں سب سے پہلے آپ کا تعارف ایک ایسی شخصیت سے کرا رہا ہوں جو آج ہم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکی ہے۔۔۔۔۔"

تو پورے ایوان میں غم واندوہ اور رنج و ملال کا سماں بندھ گیا، اور کتنی ہی آنکھیں اشک ریز تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ خان مرحوم جیسے قابلِ قدر انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے، اور ان کی بے وقت موت سے بزمِ قرآنی میں جو خلاء پیدا ہوا ہے مشکل پر کیا جا سکیگا۔ اس نقصانِ عظیم کی تلافی سالوں تک ممکن نہیں۔ (مذکورہ قرار دادِ تعزیت' قرار دادوں کی فہرست میں اسی شمارہ میں شامل ہے)۔

استقبالیہ کے بعد اب ادارہ طلوعِ اسلام کی سالانہ رپورٹ پیش ہونی تھی، اور اسے پیش کرنے کے لئے ناظمِ ادارہ طلوعِ اسلام سٹیج پر تشریف لائے۔ مولانا عبدالرب ـــــــ پرویز صاحب کے دستِ راست اور اُن کے زندگی بھر کے عزیز ترین رفیق۔ خلوص وایثار کی جیتی جاگتی تصویر، دل کے غنی اور عزم و ہمت کے دھنی محترم مولانا کے تعارف کیلئے پرویز صاحب خود مائیک پر آئے، اور بڑے ہی اثر انگیز پیرائے میں فرمایا۔

"صاحبِ ضربِ کلیم کو اپنی دعاؤں کا صلہ حضرت ہارُونؑ کی صورت میں ملا تھا۔ میری دعائے نیم شبی نے مجھے عبدالرّب عطا کر دیا۔ تینتیس برس سے یہ اپنا حقِ رفاقت کو نبھاتے چلے آرہے ہیں۔ ہر کٹھن مرحلے پر یہ اپنے مخلصانہ مشوروں سے مجھے نوازتے آئے ہیں۔ ہر مشکل مقام پر ان کی اصابتِ رائے مجھے سہارا دیتی رہی۔ اس بڑھاپے میں بھی یہ پورے ولولے سے میرے شریکِ سفر ہیں۔ گو اب نگاہوں سے دُور سہی، دل سے دُور نہیں۔"

اس تعارف کے بعد مولانا نے اپنی رپورٹ کا آغاز کیا، اور اپنی اس خوش نصیبی پر اظہارِ مسرت کیا کہ جہاں سابقہ کنونشن میں انھوں نے لغات القرآن کی پہلی جلد پیش کرنے کی سعادت حاصل کی تھی وہ ایک سال بعد اس کنونشن میں چوتھی اور آخری جلد پیش کرنے پر نازاں ہیں ـــــــ اور اس کے ساتھ مفہوم القرآن کے ابتدائی صفحات کا نمونہ پیش کرنے پر بھی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ادارہ کی مالی مشکلات اور احباب کی فیاضانہ پیشکش اور تعاون کی تفصیل بھی پیش کی۔ انھوں نے اسے قرآنی تحریک کا عظیم کارنامہ قرار دیا کہ مفکرِ قرآن کی زندگی بھر کی علمی و فکری کاوش ایک شاہکار کی حیثیت سے صفحۂ قرطاس پر موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ ہوگئی۔ اور وقت آگیا ہے کہ

قرآن فہمی کے سلسلے میں احباب اس کاوش سے پورا پورا کام لیں۔ اور قرآنی مطالعہ کے مراکز قائم کر کے اسے افہام و تفہیم کا محور بنائیں۔

قرآنی فکر کے ارتقائی مراحل کا ذکر کرتے ہوئے مولانائے محترم نے ان نئی قائم شدہ بزموں کی تفصیلی بیان کی جو گذشتہ ایک سال کے دوران پاکستان اور بیرونِ پاکستان میں قائم ہوئیں، اور جن کی بدولت ذہنی انقلاب کی اس عظیم تحریک کو انگلستان تک برگ و بار لانے کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں۔

اسی سلسلہ میں مولانا نے عائلی ضوابط کے آرڈیننس کو اسلام کی تاریخ میں انقلابِ عظیم کا پیش خیمہ اور صدرِ مملکت کے اس کارنامہ کو موجبِ تحسین و تبریک قرار دیا۔ کیونکہ اس آرڈیننس کے نفاذ سے صنفِ نازک کے صدیوں کے مظلوم طبقہ کو قرآن کے عطا فرمودہ حقوق سے بہرہ یاب ہونے کے مواقع حاصل ہو گئے ہیں۔ اور زندگی کی دوڑ میں انھیں پہلی بار ملک و ملت کی خدمت کا امکان میسر آیا ہے۔

محترم ناظمِ ادارہ نے اپنی رپورٹ میں اس پر اظہارِ اطمینان کیا کہ تعلیمی کمیشن نے ادارۂ طلوعِ اسلام کی پیش کردہ تجاویز کو اپنی خصوصی توجہ کا مرکز قرار دیا۔ انھوں نے صحیح خطوط پر تعلیم و تربیت کی اہمیت واضح کی اور قومی کردار کی حقیقی تعمیر کیلئے اُسے ضروری اور لابدی قرار دیا کہ قرآنِ کریم کی عطا فرمودہ مستقل اقدار اور غیر متبدل اصولوں کو نصابِ تعلیم کی اساس بنایا جائے۔ (ناظمِ ادارہ کی رپورٹ اشاعتِ زیرِ نظر میں شامل ہے)

پرویز صاحب کا استقبالیہ

ناظمِ ادارہ کی رپورٹ کے بعد میرِ کارواں کے استقبالیہ خطاب کی باری تھی۔ پرویز صاحب مائیک پر آئے۔ اس دفعہ اُن کے استقبالیہ کا عنوان تھا:۔

مژدۂ صبح

دریں تیرہ شبانم دادند
شمعِ کشتند و زخورشید نشانم دادند

احباب کے استقبال کے ساتھ ساتھ یہ استقبالیہ مشتمل ہوتا ہے ان اہم واقعات پر جو قرآنی تحریک کی ارتقائی رفتار کے سلسلہ میں دورانِ سال میں وجود پذیر ہوتے ہیں۔ اور ان ممکناتِ زندگی پر جو قرآنی تصوّرات کو محسوس و مشہود پیکروں میں اُبھار اُبھار کر منظرِ عام پر لئے چلے آ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے واضح کیا کہ زرعی اصلاحات کے نفاذ اور زمینداری نظام کے خاتمہ کے بعد تین ایسی لعنتیں باقی تھیں جو (اقبالؒ کے الفاظ میں) وجہِ مرگِ انسانیت ہیں ـــــ یعنی سلطانیٔ ملّائی و پیری۔ اور اب عسکری نظام نے مختصر سی مدت میں ان لعنتوں کی "مقدس گرفت" کو بڑی حد تک ڈھیلا کر دیا ہے۔

پرویز صاحب نے عائلی ضوابط کے آرڈیننس کے نفاذ پر والہانہ مسرت کا اظہار کیا، اور واضح کیا کہ یہ مبارک قدم

مذہب و سیاست کی اس ثنویت کے لئے پیامِ موت ہے، جو دورِ ملوکیت میں پیدا ہوئی، اور اس نے صدیوں تک اُمت بیچاری کو استبداد کے دوہرے شکنجوں میں کسے رکھا، اسی عظیم واقعہ کی بنا پر انھوں نے ۳ مارچ کو تاریخِ اسلام کے ایک "یادگار نوروز" کے الفاظ سے یاد کیا۔

مفکرِ قرآن نے انتہائی مؤثر الفاظ میں اس حقیقت کو پیش کیا کہ زمانے کے تقاضوں نے مجبور کر دیا ہے کہ دنیا بھر کے آستانوں سے ٹھکرایا ہوا انسان پھر سے خدا کے دروازے پر دستک دے۔ مفاد پرستیوں کی کوئی قوت اب زمانے کے سیلِ رواں کے سامنے روک بن کر نہیں ٹھہر سکتی۔ اب صحنِ عالم کی ہر شاخ جوشِ نمو سے بیتاب ہے۔ پوری فضا قرآن کی آواز سے معمور ہو رہی ہے۔ وہی آواز، جو کچھ عرصہ قبل جرمِ عظیم سمجھی جاتی رہی تھی، اب حکومت کے ایوانوں اور عدالت کے کاشانوں تک سے فردوسِ گوش بن رہی ہے۔ (پرویز صاحب کا یہ استقبالیہ اسی اشاعت میں ملاحظہ فرمائیے)۔

دوسرا اجلاس

اہم خطاب ۷ اپریل۔ چار بجے بعد دوپہر، حاجی نظام بخش صاحب خواجک زئی کی صدارت میں دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ اس نشست میں پرویز صاحب کا وہ اہم، فکر انگیز اور بصیرت افروز خطاب فردوسِ گوش بنتا تھا جس کا عنوان تھا ـــــ

"اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟"

کس قدر علم افروز تھا یہ موضوع، اور ارتقائے وقت کی کس قدر اہمیت و ضرورت وابستہ ہے اس کے جواب سے۔ ایک مفکرِ قرآن ہی اس کا موزوں ترین اور علیٰ وجہ البصیرت جواب دے سکتا ہے۔ چنانچہ تلاوتِ کلامِ پاک اور خلیل صاحب کی نظم کے بعد جب پرویز صاحب اس اہم موضوع کو لے کر مائیک کے سامنے آئے تو وسیع و عریض اور حاضرین سے بھرپور پنڈال ہمہ تن گوش تھا۔

آغازِ خطاب کرتے ہوئے پرویز صاحب نے سب سے پہلے ان اخلاقی اقدار کا تجزیہ کیا جنھیں "عالمگیر سچائیوں" کے نام سے، ابوالکلام آزاد مرحوم اور دوسرے بزرگ تمام مذاہب کا مشترک سرمایہ قرار دیتے رہے ہیں۔ پرویز صاحب نے واضح کیا کہ "اس قسم کی سچائیاں" تو دہریوں اور خدا کے منکروں کے ہاں بھی مروّج آ رہی ہیں۔ انہیں مذہب سے ہی کیوں مخصوص کیا جائے۔ اور اس کے بعد وہ ایک قدم آگے بڑھے اور مذہب کے مقابلہ میں **دین** کا ارفع و اعلیٰ مفہوم پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام ایک دین ہے، اور دین چند اخلاقی اقدار کا نام نہیں، بلکہ یہ ایک ہمہ گیر نظامِ زندگی ہے جو حیاتِ انسانی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ یہ زندگی کو وہ بنیادیں عطا کرتا ہے جن پر اخلاقی اقدار کی پوری عمارت استوار ہوتی ہے۔ دین زندگی کے اُن بنیادی تصورات کا حامل ہے، جو نگاہ کے زاویئے بدل دیتے ہیں اور انسانی سعی و عمل کا رُخ متعین کرتے

ہیں۔ اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے ان تصورات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے دینِ اسلام کا تقابل مروّجہ مذاہب سے کیا۔
مفکرِ قرآن کا مخصوص اندازِ بیان، دلنشیں دلائل و براہین، متعلقاتِ زندگی کی نقاب کشائی، یہ سب کچھ ایک نہرِ سلسبیل کی طرح قلوب و اذہان کو سیراب کرتا چلا گیا۔ ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کے حیات آفریں اور حسین و جمیل گوشوں سے نقاب اٹھتے چلے گئے۔ قرآنی تصورات کی تابناکیاں، فکر و نظر کی پہنائیوں کو جگمگاتی اور اسلام کی پہنائیوں کو متبسّم کرتی گئیں، اور جب غروبِ آفتاب کے ساتھ یہ خطاب ختم ہوا تو ہر زبان بے ساختہ پکار رہی تھی کہ واقعی یہ دین صرف اسلام ہی ہو سکتا ہے۔ دلائل و براہین کی عظمت و رفعت کے اعتبار سے یہ خطاب اس قابل تھا کہ عصرِ حاضر کی ہر مروّجہ زبان میں اس کا ترجمہ کر کے اس کی کرنیں دنیا بھر میں پھیلا دی جائیں۔ تاکہ خدا کی یہ زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے، اور مظلوم انسانیت اس روشنی میں دینِ حق کے اس صراطِ مستقیم پر چلنے کے قابل ہو جائے جو اس کے ارفع و اعلیٰ مقاصد کا معراجِ عظیم ہے۔ (یہ خطاب آئندہ اشاعت میں دیکھئے)

تیسرا اجلاس

۷ اپریل، رات کے نو بجے کنونشن کا تیسرا اجلاس محترم ڈاکٹر خان عبدالحکیم خان کی صدارت میں آغاز پذیر ہوا۔ تلاوتِ کلامِ پاک اور نظم کے بعد ایک فرو گذاشت کی تلافی کے لئے پرویز صاحب سٹیج پر نمودار ہوئے۔ چند ممتاز احباب کا تعارف باقی تھا، اور اس کی تکمیل پرویز صاحب نے اپنے ذمّہ لی۔ سب سے پہلے، اس سلسلہ میں محترم قمر ثابت صاحب ایوان کے سامنے آئے ——— بزمِ لاہور کے نقیب و مکبّر قمر ثابت صاحب۔ ان کے تعارف سے متعلق ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے پرویز صاحب نے کہا:۔

> "پہلے پہل یہ میرے درسوں میں باقاعدگی سے آنے شروع ہوئے۔ بڑی خاموشی سے سنتے اور خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے۔ درس کے دوران عجیب سا تأثر ان کے چہرے پر ہوتا۔ اور کبھی کبھی پلکوں پر آنسو بھی۔ ایک دفعہ یہ مجلس سے غائب نظر آئے، اور جب دوبارہ آئے تو میں نے پوچھا کہ آپ کہاں چلے گئے تھے؟ جو کچھ انھوں نے جواباً کہا وہ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا ——— "اب مجھے کہاں جانا ہے۔ جہاں جہاں جانا تھا ہو آیا۔ اب تو میں ہمیشہ کے لئے یہیں کا ہو چکا ہوں"۔ یہ ثابت صاحب کا جواب۔ کتنے ہی کوچوں کے چکر لگائے اور کتنے ہی دروازوں پر دستک دی۔ آخر قرآن کی بارگاہ سے تسکین کا سامان مل ہی گیا۔ اخبارات میں ہماری پبلسٹی انہیں کے دم سے ہے قرآن کے صدقے میں ایسا قیمتی کارکن مفت ہاتھ آ گیا۔ خدا سلامت رکھے!"

ڈاکٹر حیات ملک صاحب کے تعارف کے سلسلہ میں پرویز صاحب نے فرمایا:۔

"ان کا نام حیات رکھا گیا۔ بڑے ہو کر حیات بخش ثابت ہوئے۔ اب نہ صرف دم توڑتے انسانوں بلکہ مُردہ بزموں کو "نئی زندگی" بخشتے ہیں۔ خدا انہیں عمرِ دراز بخشے۔ ہمیں ان پہ فخر ہے"

سلسلۂ تعارف کے بعد محترم عنایت اللہ صاحب "دھتکارے ہوئے انسان" کے عنوان سے اپنا اچھوتا مقالہ لے کر سٹیج پر آئے ——— وہی عنایت، جن کی "آپ بیتی" نے (جو اکتوبر ۱۹۶۰ء کے طلوعِ اسلام میں "آخری سہارے" کے عنوان سے شائع ہوئی) حلقۂ قارئین میں ایک دُھوم سی مچا دی تھی۔ پرویز صاحب نے ان کے تعارف میں کہا کہ

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی
کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغِ بے نیام آیا

ایک ابتلا کا شکار ہو کر جب عنایت کو جیل جانا پڑا تو پرویز صاحب اور اُن کے احباب کو ایک دھچکا سا لگا تھا۔ لیکن ہفت روزہ طلوعِ اسلام کے سابق مدیر کا یہ حقیقت شناس بھائی جب جیل کی سلاخوں سے باہر آیا تو "مجرموں کی بارگاہ" سے وہ موتی سمیٹ کر لایا جو اس کے حقیقت نگار قلم سے اب اصلاحِ معاشرہ کی تحریک میں چکا چوند پیدا کر رہے ہیں۔

"دھتکارے ہوئے انسان" اسی سلسلۂ تحریر کی ایک کڑی ہے۔ اور حوالات کے "مجرم احباب" کے جرائم کا ایک عبرتناک تجزیہ۔ ان جرائم کا پسِ منظر اور جذبۂ محرکہ کیا ہے؟ یہ مقالہ اسی سوال کا نکھرا ہوا جواب ہے۔ عنایت کی عقابی نگاہیں، مجرموں کے جذبات و احساسات کی گہرائیوں تک پہنچی ہیں، اور اس کے بعد جو کچھ وہ صفحۂ قرطاس پر لائی ہیں، ہمیں یقین ہے کہ وہ ایک دن جسدِ ملت کے اس رِستے ہوئے ناسور کے اندمال کا موجب بنے گا۔

پرویز صاحب کا درسِ قرآن

رات بڑی تیزی سے بیت رہی تھی۔ دس بج رہے تھے، اور اب پرویز صاحب کے درسِ قرآن کی باری تھی۔ "انسان اور خدا کے دشمن" ان کے درس کا موضوع تھا۔ یہ دشمن کون تھے؟ وہی "سلطانی و ملائی و پیری" کے نمائندے، جن کے باہمی گٹھ جوڑ نے ہر دور میں انسانیت اور خدا کے سچے دین کو پامال کیا۔ جنہیں قرآن نے صاحبِ ضربِ کلیم کے مقابلے میں فرعون، ہامان اور قارون کے نام سے پیش کیا۔ ایک ملوکیت کا نمائندہ، دوسرا مذہبی پیشوائیت کا اجارہ دار اور تیسرا سرمایہ داری کا نقیب۔ حق و باطل کی ہر تاریخی آویزش میں یہ "اقانیمِ ثلاثہ" شانہ بشانہ ان داعیانِ حق کے مقابلہ میں آئے جو وحیِ خداوندی کی روشنی میں احترامِ آدمیت کے پاسبان بن کر اُٹھے۔ پرویز صاحب نے تاریخِ انسانی کے اسی سلسلۂ تقابل کو اپنے مخصوص اور دلنشیں انداز میں قرآن کی زبان سے بیان کیا، اور انسان اور خدا کے دشمنوں کے چہروں کے دلفریب نقاب تار تار کر ڈالے۔ خطاب کیا تھا۔ تاریکیٔ شب میں شمعِ قرآنی کی تنویریں تھیں جو قلب و نگاہ کو منور کر رہی تھیں۔ دلوں سے بے ساختہ آواز اُٹھ رہی تھی کہ

ساقی! سیاہ خانۂ ہستی میں دیکھنا   روشن چراغِ کعبہ سرِ شام کر دیا

(یہ خطاب آئندہ اشاعتوں میں سامنے آئے گا۔)

چوتھا اجلاس

رپورٹیں ۸ اپریل کی صبح کو نو بجے الحاج خیر محمد صاحب پراچہ کی صدارت میں، حافظ برکت اللہ صاحب نے تلاوتِ کلام پاک سے چوتھے اجلاس کا آغاز کیا۔ اور خلیل مرزا کی نظم کے بعد مجلسِ عاملہ طلوعِ اسلام کے کنوینر، شیخ محمد تشفیع صاحب نے اپنی رپورٹ پیش کی، اور پبلسٹی کمیٹی کی مساعی جمیلہ اور اس کے خاتمہ کے بعد مجلسِ عاملہ کی کارگزاریوں پر بالتفصیل روشنی ڈالی۔ شیخ صاحب کے بعد چوہدری عبدالرحمٰن صاحب مینیجنگ ڈائرکٹر میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ نے میزان پبلیکیشنز کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے اس طباعتی ادارہ کا تعارف کرایا۔ اور بالتفصیل اس کے قیام کا پسِ منظر اور ضرورت واضح کی۔

قراردادیں رپورٹوں کے بعد قراردادوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ (یہ تمام قراردادیں اسی اشاعت میں روئیداد کے خاتمہ پر دیکھئے)۔

(۱)۔ سب سے پہلے ڈاکٹر عبدالحکیم خاں صاحب (مردان) نے لغات فنڈ سے متعلق ایک تفصیلی قرارداد پیش کی جس میں لغات فنڈ کے استعمال کے بارے میں اصولی طریق کار وضع کیا گیا تھا اور اس کے لئے ایوان کی منظوری طلب کی گئی تھی۔ ایوان نے اتفاقِ رائے سے اس قرارداد کو منظور کر لیا۔

(۲)۔ دوسری قرارداد میں مجلسِ عاملہ کی تشکیل کا اصولی ضابطہ پیش کیا گیا تھا اور اس کی تحریک چوہدری عبدالرحمٰن (لاہور) نے مرزا علی احمد خاں (پشاور) کی تجویز پر کی تھی۔ اس قرارداد میں یہ طے کیا گیا تھا کہ ہر بزم کا نمائندہ بلحاظِ عہدہ مجلسِ عاملہ کا رکن قرار پائے گا۔ اور بزمِ لاہور کا نمائندہ اس کا باضابطہ صدر۔ مجلسِ عاملہ کا مرکز لاہور میں ہوگا، اور سالانہ کنونشن و سب کنونشن کے مواقع پر اسکے سال میں دو اجلاس ہوا کریں گے۔ قرارداد میں صدر کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ لاہور کے اراکینِ بزم میں سے حسبِ ضرورت اصحاب پر مشتمل اپنی ایگزکٹو کمیٹی کی تشکیل کریں گے۔ جو عملی کام میں مجلسِ عاملہ کی طرف سے تمام ذمہ داریاں سرانجام دے گی۔ کمیٹی مذکورہ ادارہ کی ہدایات کے مطابق کام کرے گی، اور ادارہ کے سامنے جوابدہ بھی ہوگی۔

قرارداد مذکور کی تائید کرتے ہوئے مرزا علی احمد خاں (پشاور) نے ادارہ کی مطبوعات کی اشاعت پر زور دیا، اور کہا کہ قرآنی فکر کی اشاعت کے سلسلہ میں بزموں پر ایک اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور انہیں ہر اجلاس میں اس کے متعلق اپنی کارگزاریوں کا پورا جائزہ لینا چاہیئے۔

قرارداد کی اہمیت کو مزید واضح کرتے ہوئے مولانا عبدالرب صاحب نے فرمایا کہ بزمیں اصولی ہدایات کے

تحت کام کر رہی ہیں۔ اور اپنی جد و جہد میں حتی الوسع کوشاں رہتی ہیں۔ حیدر آباد سب کنونشن میں بزموں کی ان کوششوں کا جائزہ لیا گیا تھا ضرورت تھی کہ ان کوششوں کی نگرانی کی جائے، تاکہ مفید نتائج پیدا ہوں۔ مولانائے محترم نے اس پر اظہار افسوس کیا کہ محض چند بزمیں اپنی کارکردگی کی رپورٹ برائے اشاعت ارسال کرتی ہیں، باقی بزمیں اس معاملہ میں شدید غفلت سے کام لے رہی ہیں۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ مجلس عاملہ کی تشکیل سے اب کام باقاعدگی سے ہو سکے گا۔

(۳)۔ تیسری قرارداد اس اجلاس میں حافظ برکت اللہ صاحب (کراچی) نے پیش کی۔ قرارداد میں میزان پبلیکیشنز کے قیام کو مستحسن اقدام قرار دیا گیا اور قرآنی حلقۂ احباب سے توقع کی گئی تھی کہ وہ اس ادارہ سے پورا پورا تعاون کریں۔

قرارداد کی تحریک کرتے ہوئے محترم حافظ صاحب نے فرمایا کہ اپنے دیگر احباب کے ساتھ وہ مدت سے اس صورت حال پر غور کر رہے تھے کہ پرویز صاحب کی بہت سی توانائیاں کتب کی طباعت و اشاعت کے معاملہ میں خرچ ہو رہی ہیں پرویز صاحب کے قیمتی وقت اور توانائیوں کو ان امور سے بچا کر ایک عظیم فکری انقلاب کے مفید ترین کاموں کے لئے فارغ کرنے کی اشد ضرورت تھی۔ اور اس کے متعلق بہت کچھ سوچا گیا۔ میزان پبلیکیشنز کا قیام اسی غور و خوض کا خوش آئند نتیجہ ہے۔

محترم گلزار حسین (کراچی) نے اس قرارداد کی تائید کرتے ہوئے یہ اضافہ کیا کہ میزان پبلیکیشنز میں شریک احباب کو ہدیۂ تبریک پیش کیا جائے۔ انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ 'میزان' کے ایک حصہ دار نے اپنی زمین بیچ کر اس میں شرکت کی۔ اور اسی طرح سب حصہ داروں نے ایک عظیم قرآنی مشن میں پورے خلوص اور حسنِ نیت سے شمولیت کی ہے۔ یہ قرارداد بھی اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔

یوم الحساب

اس مرحلہ پر محترم محمد اسلام صاحب (کراچی) والہانہ طور پر مائیک کی طرف بڑھے اور بڑے ہی مخلصانہ جوش سے ایوان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب دن رات یہ سوچتے ہیں کہ قرآنی فکر کو کیونکر تیزی سے آگے بڑھایا جائے۔ اور کیونکر یہ عظیم مقاصد جلد از جلد تکمیل کو پہنچیں۔ مجلس عاملہ کی تشکیل نے ان امکانات کو کافی روشن کر دیا ہے۔ ایک ہیئتِ مرکزی سے ہمارا رابطہ قائم ہو گیا ہے۔ آج کا دن ہمارے لئے یوم الحساب بن جانا چاہئے۔ جہاں تمام بزمیں مرکزی فنڈز بڑھانے پر غور کریں وہاں اس اجلاس میں گذشتہ چھ ماہ کا اپنا اپنا نامۂ اعمال بھی پیش کریں۔ اسلام صاحب کی اس دعوت پر مختلف بزموں کے نمائندے باری باری سٹیج پر آئے اور مختصراً اپنی اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی۔

اس محاسبہ کے بعد مجلس عاملہ کی تشکیل کے سلسلہ میں مشاورت کے لئے عام اجلاس برخواست ہو گیا۔ اور جب مجلس عاملہ کے ارکان اور اس کے فنڈز کے متعلق ضروری امور طے کر لئے گئے تو اجلاس دوبارہ شروع ہوا۔

از سرِ نو اجلاس کا آغاز ہونے پر چوہدری عبد الرحمٰن صاحب (لاہور) نے بزمہائے طلوعِ اسلام کی بعض انتظامی

خامیوں اور فروگذاشتوں کی تفصیل پیش کی اور یہ شکایت کی کہ اکثر بزمیں مجلس عاملہ سے کما حقہٗ تعاون نہیں کر رہیں۔ ان کی رپورٹیں تک موصول نہیں ہو رہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ تجربہ نے بتایا ہے کہ بزموں میں ایسے عناصر بطور ارکان شریک ہو جاتے ہیں جو اپنی تخریبی حرکات سے تحریک کے کاموں میں روڑے اٹکاتے رہتے ہیں۔ وہ مختلف انداز سے دیگر اراکین کے دل میں وسوسے پیدا اور شبہات انگیخت کرتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے کوئی خوشگوار امیدیں وابستہ کرنا خود فریبی ہے، اس لئے ایسے عناصر کا محاسبہ اشد ضروری ہے۔ جب مقصد قرآنی فکر کی نشر و اشاعت ہے تو پھر ان لوگوں کو کیونکر برداشت کیا جاسکتا ہے جنہیں تخریبی سرگرمیوں کے سوا اور کسی چیز سے دلچسپی نہ ہو۔ انہیں بعد از تحقیق و تفتیش تحریک سے الگ کر دینا چاہیئے۔

پانچواں اجلاس

(طاہرہ بیٹیاں قرآنی فکر و بصیرت کے پلیٹ فارم پر)

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس اپنے درخشندہ اور دُور رس نتائج کے اعتبار سے قرآنی تحریک کی اس منزل پر ایک سنگِ میل اور نشانِ راہ (LAND MARK) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اجلاس کے صدقے میں یہ حقیقت پہلی بار نکھر کر منظرِ عام پر آگئی کہ جہاں تک قرآنی فکر کی گہرائیوں میں ڈوب کر اُبھرنے کا تعلق ہے "بابا جی" کی "طاہرہ بیٹیاں" ان کے "سلیم بیٹوں" سے بہت آگے بڑھ چکی ہیں۔ اور اس حیات آفریں فکر کے سلسلہ میں ان کی جگر سوز کاوشیں اب اس حد تک بار آور ہو چکی ہیں کہ اسے ملّتِ اسلامیہ کی نشأۃِ ثانیہ میں پورے یقین و اعتماد سے بیش بہا سرمایہ حیات کے طور پر کام میں لایا جاسکے گا۔ یہ نورانی شمعیں سینکڑوں نہیں، ہزاروں گھروں میں قرآنی روشنی کو پھیلانے کے قابل ہو سکیں گی اور حیاتِ ملّی کے بہت سے تاریک گوشے ان کی بصیرتِ قرآنی سے جگمگا اٹھیں گے۔

ٹھیک چار بجے بعد دوپہر جب یہ اہم اجلاس مولانا عبدالرّب صاحب کی صدارت میں شروع ہوا تو سب سے پہلے محترمہ ثریا عندلیب (جو خلیفہ شجاع الدین مرحوم کی صاحب زادی ہیں) نے بڑے پُرسوز اور اثر انگیز لہجے میں تلاوتِ کلامِ پاک سے تأثر کا سماں باندھ دیا۔ قرآن عائلی زندگی میں مرد اور عورت کے حسنِ روابط کا جو دلکشا اور رُوح نواز خاکہ پیش کرتا ہے، ثریا عندلیب صاحبہ اُسے قرآن کی زبان میں مجسّم تصوّر کے سامنے لا رہی تھیں۔ قرآن کا حسنِ بیان اور اس کی ضیا باریاں! عجیب نظر افروز تھا یہ منظر۔ ایسا نظر آتا تھا کہ ؎

چشمۂ آفتاب سے نُور کی ندیاں رواں

ان کے بعد ڈاکٹر عبدالودود صاحب کے گھرانے کی دو ننھی بچیوں (ثوبیہ اور ردمینہ) نے مل کر ایک نظم پڑھی نظم کیا تھی؟ ملّت کے عروج و زوال کا تقابل ـــــ تیرہ سو برس میں ہم کس اوجِ ثریا تک پہنچے اور پھر تحت الثریٰ کی

رکن ہونا کی پستیوں میں لپیٹے گئے کہ صدیوں تک پھر نہ اُٹھ سکے۔

اب پرویز صاحب کا فریضہ انھیں کشاں کشاں پلیٹ فارم کی طرف لا رہا تھا۔ جوشِ مسرت کے آنسو پلکوں پہ لئے وہ مائیک پر آئے۔ یہ "باباجی" کی زندگی کا انتہائی مبارک و مسعود دن تھا۔ ایک عظیم مفکرِ قرآن کی اشکبار نگاہیں، دیدۂ تر کی سالہا سال کی بے خوابیوں اور قلبِ مضطر کی بیتابیوں کا صلہ محسوس و مشہود پیکروں میں نگاہوں کے سامنے پا رہی تھیں ان کے خونِ جگر کی آبیاری، ایک لہلہاتی ہوئی فصل نوبہار کو جنم دے چکی تھی۔ سالانہ کنونشن میں وہ پہلے اپنے سلیم بیٹوں کی طرف اُمید بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے، اور اب کی بار یہ نگاہیں اپنی طاہرہ بیٹیوں کو بھی سامنے پا رہی تھیں —— ہاں یہ بنات النعش نورانی چادریں اوڑھے اُن کے لئے یہ نوید جانفزا لیکر آئی تھیں کہ:

"اچھے باباجی! آج اس کا مشاہدہ کرلو کہ آپ کی کاوشیں رائیگاں نہیں گئیں بلکہ حُسن و کمال حاصلِ مراد کو پہنچ گئیں۔ وہ دن گئے جب آپ اس انجمن میں تنہا تھے۔ اب آپ کی داستان قمریوں، طوطیوں اور عندلیبوں کی زبانی سارے چمن میں پھیل رہی ہے۔

اور انوارِ قرآنی سے ساری فضا معمور ہو رہی ہے"

اس نویدِ مسرت کو خوش آمدید کہتے ہوئے پرویز صاحب مائیک پر آئے اور انھوں نے "طلوعِ اسلام" کی قرآنی تحریک کے سلسلہ میں اپنی "طاہرہ بیٹیوں" کے ذوق و شوق، ان کی کاوشوں اور کارگزاریوں کی داستان پیش کرتے ہوئے حسبِ ذیل خطاب فرمایا:-

پرویز صاحب کا تعارفی خطاب

"حکومت کی طرف سے فیملی لاز اور یتیم پوتے کی وراثت سے متعلق آرڈیننس کے نفاذ پر مجھے ملک کے مختلف گوشوں سے پیغامِ مبارکباد موصول ہوئے۔ میں اُن تمام احباب کا دل سے شکر گذار ہوں۔ لیکن اس مبارکباد میں میرے ساتھ وہ تمام احباب بھی برابر کے شریک ہیں۔ اس لئے کہ اگر ان کی سعی و کاوش میرے شاملِ حال نہ ہوتی تو ہمیں یہ کامیابی کبھی نصیب نہ ہوتی۔ اس ضمن میں میں سب سے زیادہ مستحقِ مبارکباد سمجھتا ہوں اپنی ان قرآنی بہنوں اور "طاہرہ بیٹیوں" کو، جن کی شبانہ روز اَن تھک کوششوں نے سینکڑوں ہزاروں گھرانوں میں فکرِ قرآنی کی شمعیں روشن کر دیں، اور ان کی نور پاشیوں نے غیر قرآنی تصورات و معتقدات کی ظلمتوں کے پردے چاک کر دیئے۔ اور اس طرح ملک میں ایسی فضا پیدا ہو گئی جس میں ان قوانین کے اعلان کا اس جذب و شوق سے استقبال ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ کنونشن کے اجتماعات میں باہمی تعارف کے سلسلہ میں ان بہنوں اور بچیوں کا اس سے پہلے ذکر نہیں آسکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کنونشن میں ان کی نمائندگی نہیں ہوتی تھی۔ اس سال کنونشن میں بزمِ خواتین کی نمائندہ بھی شریک ہیں۔ اور اس اجتماع میں بالخصوص قرآنی خواتین بیشتر حصہ لے رہی ہیں۔ اس لئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ مختصر الفاظ میں ان بہنوں اور بچیوں کا

ذکر کر دیا جائے جنھوں نے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں نمایاں حصّہ لیا ہے ۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ میں ان تمام خواتین کا تعارف کرا سکوں جنھوں نے اس تیرہ چودہ سال کی طویل مدّت میں اس فکر سے دلچسپی لی ہے ۔ اس لئے یہ فہرست انہی تک محدود رہے گی جن کے نام اس وقت میرے افقِ ذہن پر اُبھر کر آ رہے ہیں ۔ اس میں اگر کسی کا ذکر رہ جائے تو اُسے میرے سہو پر محمول کیا جائے ۔

کراچی چونکہ تشکیلِ پاکستان کے بعد اس فکر کی نشر و اشاعت کا اوّلین گہوارہ کراچی تھا ، اس لئے اس تذکرہ کا آغاز وہیں سے کیا جاتا ہے ۔ اس ضمن میں سب سے پہلے میرے سامنے محترم شیخ محمد شفیع اور محمّد انور صاحب کا گھرانہ آتا ہے ۔ جو کراچی میں قرآنی فکر کا مرکز ہے ۔ ان کی بیگمات (جو میرے لئے بمنزلہ طاہرہ بیٹیوں کے ہیں) قرآنی فکر کی جگمگاتی شمعیں ہیں ۔ جن کی کرنیں ، اپنے صحن خانہ سے نکل کر دُور دُور تک پہنچتی ہیں ۔ جن احباب کو ان کے بچّوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس حقیقت کی شہادت دیں گے کہ جن بچّوں کی تربیت اس قسم کی ماؤں کی آغوش میں ہوتی ہو ، اُن کے قلب و دماغ کس طرح شروع ہی سے قرآنی قالب میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں ۔

پھر میرے سامنے میرے عزیز قرآنی بھائی شیخ محبوب الٰہی (مرحوم) کی ہمشیرہ ، محترمہ بہن ، بیگم عبدالسّلام آتی ہیں ۔ انہوں نے قرآنی فکر کو اپنے مرحوم بھائی سے اخذ کیا ۔ اور اس کے بعد اس سے ان کی وابستگی بڑھتی چلی گئی ۔ ان کا فرزندِ اکبر ، عزیزم خالد (سلمہ اللہ تعالیٰ) جیالوجسٹ ، قرآنی فکر کا سفیر گرداں ہے ۔ اللہ اس کی ہمّت میں برکت عطا کرے ۔

اس کے بعد میرے سامنے ' وہ نحیف و نزار ' عمر رسیدہ خاتونِ محترم ، مسز عبداللہ جمال آتی ہیں ، جن کی قرآن کے ساتھ شیفتگی کا یہ عالم ہے کہ جونہی اس کتابِ عظیم کا نام ان کے سامنے آیا ، ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگ گئے ۔ وہ اپنی سِن رسیدگی اور خرابیٔ صحت کے باوجود قرآنی فکر کے عام کرنے میں شغف رکھتی ہیں ۔

لاہور لاہور میں جس گھر میں سب سے زیادہ قرآن کا چرچا رہتا ہے وہ برادر محترم میرزا محمد انور صاحب کا کاشانہ ہے ۔ انور صاحب طلوعِ اسلام کی قرآنی تحریک کے اَلسّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْن میں سے ہیں ، اور ان کی بیگم صاحبہ (بہن حمیدہ) کو قرآن کے ساتھ والہانہ شیفتگی ہے ۔ اس گھرانے سے شمعِ قرآنی کی روشنی کس طرح دور دور تک پھیل رہی ہے؟ اس کا ذکر آگے چل کر آئے گا ۔

اس گھرانے کے ساتھ ہی میرے سامنے محترم میرزا محمد خلیل اور محترم ڈاکٹر سیّد عبدالودود صاحب کے گھرانے آتے ہیں ، جن میں قرآنی فکر کے چراغ جگمگا رہے ہیں ۔ ان کے ساتھ ہی میری زبان پر عزیزہ بہن سکندرہ بیگم ڈاکٹر ریاض صاحب کا نام آتا ہے ، انہوں نے سب سے پہلے سیالکوٹ میں بزمِ طلوعِ اسلام خواتین کی طرح ڈالی تھی ۔ اور اب لاہور میں اسی فکر کی خاموش لیکن سرگرم مبلغ ہیں ۔ انہی کی رفقائے سفر ، محترمہ بہن مس حمید جہاں خواجہ اور بہن سعیدہ اختر ہیں ۔ مس خواجہ ، ایڈی میکلیگن ٹریننگ کالج کی وائس پرنسپل اور مس سعیدہ اختر وہاں پروفیسر ہیں ۔ مجھے یاد ہی نہیں پڑتا

کہ انہوں نے سردی، گرمی، آندھی، بارش میں کبھی درس یا دیگر قرآنی اجتماعات سے ناغہ کیا ہو۔ اگر وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے، تو ان کے ایمان کی پختگی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔

پھر میرے سامنے عزیزہ بہن ثریا عندلیب آتی ہیں۔ قوم کے محسن، عائلی کمیشن کے اوّلین صدر، خلیفہ شجاع الدین مرحوم کی صاحبزادی، جنہیں علمی ذوق اور اسلام سے وابستگی ورثہ میں ملی ہے۔ طلوعِ اسلام سے ان کی دلچسپی شروع سے چلی آ رہی ہے۔ انہیں ایک ہی دُھن ہے، اور وہ یہ کہ ان کے بچے قرآنی سیرت و کردار کے چلتے پھرتے آئینے ہوں۔ اللہ ان کی اس مقدس آرزو کو مثمر بار فرمائے۔

سرگودھا

اس سال سرگودھا میں بزمِ خواتین کا قیام عمل میں آیا ہے اور اس بزم کی نمائندہ خواتین اس کونشن میں شریک ہیں۔ یہ سعادت سب سے پہلے ان بہنوں کے حصہ میں آئی ہے، جس کے لئے میں انہیں مستحقِ تبریک و تہنیت سمجھتا ہوں۔ ان میں زیادہ سرگرم ارکان یہ ہیں:۔ محترمہ (بہن) مسرت صاحبہ (ہمشیرہ محترم مجید الرحمٰن صاحب)، محترمہ (بہن) فرخندہ بیگم (اہلیہ محترم محمد عثمان صاحب)، محترمہ (بہن) رشیدہ بیگم (اہلیہ محترم الطاف علی صاحب)، عزیزہ (طاہرہ بیٹی) رضیہ بیگم (محترم فیاض علی خاں صاحب کی صاحبزادی) محترمہ (بہن) صغرٰی بیگم (والدۂ محترمہ مجید الرحمٰن صاحب) محترمہ (بہن) مومنہ راشدہ (بیگم محترم محمد رشید صاحب)۔

طاہرہ بیٹیاں

ان عزیز بہنوں کے بعد میرے سامنے طاہرہ بیٹیاں آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان میں سب سے پہلے اس طاہرہ بیٹی کا نام آئے گا جس کے نام سے میں نے "طاہرہ کے نام خطوط" لکھے ہیں۔ یہ بیٹی اب بیگم کشفی اور اُمِ عائشہ کے نام سے متعارف ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس سے زیادہ اس کے تعارف کی ضرورت بھی نہیں۔ اس کا مجھے افسوس ہے کہ اس بچی نے قرآن کے جنون میں اپنی صحت کھو دی ہے، جس کی وجہ سے مجھے بڑی تشویش رہتی ہے۔ خدا اسے عمر اور صحت عطا کرے۔

کراچی میں دوسری طاہرہ بیٹی، عزیزہ رضیہ یعقوب ہے۔ فلسفہ کی ایم۔ اے، اور سینٹ جوزف کالج میں فلسفہ کی پروفیسر۔ قرآن اور اقبالؒ کے فلسفہ کے سلسلہ میں، اس بچی نے مجھ سے بہرہ وافر پایا ہے۔ آجکل اعلیٰ تعلیم کے سلسلہ میں ہوائی جزائر کی یونیورسٹی میں مصروفِ تحقیق ہے اور قرآنی فکر کی سرگرم مبلغ۔ اس بچی سے بھی میری بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

اب میری زبان پر اس طاہرہ بیٹی کا نام آتا ہے جس نے لاہور کی تعلیمی فضا میں قرآنی فکر کا انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یہ ہے برادرم محمد انور صاحب کی صاحبزادی، عزیزہ، شمیم انور۔ کنیرڈ کالج میں تاریخ کی پروفیسر، لیکن اپنی سٹوڈنٹس کی ہر مشکل میں ہمدردی اور شفقت کی مرکز۔ طبقۂ نسواں کی مظلومی کے غم سے نڈھال اور پاکستان کی فلاح و بہبود کی فکر میں سرگرداں۔ نحیف و نزار، مستقل بیمار، لیکن قرآنی تصورات کے عام کرنے میں نہ دن کے چین کا خیال، نہ رات کے

آرام کی فکر۔ اللہ اس عزیز بیٹی کو صحت اور عمر عطا فرمائے۔ مجھے اس کے ہاتھوں، قرآنی فکر کا مستقبل بڑا درخشندہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کی رفیقِ سفر، اس کی خالہ زاد بہن "عزیزہ" زاہدہ ہے، جو ایم۔ اے کرنے کے بعد حال ہی میں لاہور کالج فار وومن میں انگریزی کی پروفیسر مقرر ہوئی ہے اور اپنے گرد قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والی بچیوں کا حلقہ پیدا کر رہی ہے۔

آخر میں، میرے سامنے، (سرِ دست) میری آخری طاہرہ بیٹی "ڈاکٹر زاہدہ درّانی" آتی ہے۔ محترم محمد احمد خاں صاحب درّانی کی صاحبزادی۔ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔ اپنے فن میں بڑی قابل۔ بیماروں کی معالج ہی نہیں بلکہ مونس و غمخوار۔ قرآنی فکر سے اس کی شیفتگی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ اس نے اپنی فرصت کا ایک ایک لمحہ اس کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ یہ وہ بچی ہے جس نے اس فکر کو مجھ سے درساً درساً پڑھا ہے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ مجھے اپنی اس بیٹی پر بھی فخر ہے اور اس سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

اور ایک نام تو میں بھول ہی چلا تھا، کیمبل پور کے مشہور قومی کارکن محترم میر حضرت شاہ (مرحوم) کی صاحبزادی "عزیزہ عسکریہ بیٹی" (ام وقاص) جو اپنی عمرِ زندگی کی پریشانیوں کے باوجود، قرآنی فکر کی نورانی کرنوں کو دور دور تک پھیلانے میں ہمیشہ مصروف رہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ میں نے اگرچہ قرآنی تربیت کا آغاز "مسلم بیٹوں" سے کیا تھا لیکن تجربہ نے بتایا ہے کہ "طاہرہ بیٹیاں" اس باب میں ان سے کہیں آگے ہیں۔ یقینِ محکم، عملِ پیہم، ثبات و استقامت اور پاکیزگیٔ سیرت ان کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اگر یہ کہہ دیا جائے کہ مجھے بیٹوں کے مقابلہ میں بیٹیوں کی محبت عام ہے تو میں بلا تامّل کہہ دوں گا کہ میری قرآنی فکر اور مشن کے ترکہ میں بیٹی کا حصہ یقیناً بیٹے سے دوگنا ہوگا۔

میری عزیز بہنو اور بیٹیو! اللہ تمہیں اپنے حفظ و امان میں رکھے اور تمہارے ذوق و جذبِ قرآنی میں برکت عطا فرمائے۔ قوم کا مستقبل تمہارے ہی ہاتھوں میں ہے۔ اس لئے کہ علامہ اقبال کے الفاظ میں:۔ "در خطِ سیمائے تو تقدیرِ ما"

سلسلۂ خطابات

میر کارواں کی زبانی اس تعارفی تمہید کے بعد طاہرہ بیٹیوں اور پھر طاہرہ بہنوں کے خطابات کا بصیرت افروز اور اثر آفریں سلسلہ شروع ہوا۔ یہ سلسلہ خوش خطابت کیسا تھا؟ غالب کے الفاظ میں یوں نظر آتا تھا گویا

چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش تھی

سب سے پہلے ننھی بچیوں کی باری آئی۔ عزیزہ عفت بنت خلیل، عزیزہ بیٹی، ردبینہ، سلمیٰ، نجمہ، زینت بنت لطف علی نشید قرآنی کو فردوسِ گوش بناتی چلی گئیں۔ پھر ڈاکٹر زاہدہ درّانی نے "ڈاکٹر کی مشکلات" کے زیرِ عنوان "ان مادی تصورات کی نقاب کشائی کی جو تعلیم اور پیشہ ورانہ ماحول کے نقیب بن کر زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں، اور انسانی زندگی کو مادی تصورِ حیات کے سانچوں میں ڈھال کر شرفِ انسانیت کو گہری قبر میں دفن کر دیتے ہیں۔" ڈاکٹر زاہدہ درّانی نے گذشتہ ایک سال میں مفکرِ قرآن سے درساً درساً قرآنی تعلیم حاصل کی ہے۔ چنانچہ اپنی اس سعد بختی پر اظہارِ فخر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس تعلیم نے ان کے قلب و نگاہ میں جو انقلاب پیدا کیا ہے، اُسے پیشِ نظر رکھ کر وہ پورے دعوے سے یہ کہہ سکتی ہیں کہ اگر "سلیم کے نام خطوط" اور "انسان نے کیا سوچا؟" جیسی پرویز صاحب کی مطبوعات نصابِ تعلیم میں شامل

کر دیجائیں تو پوری فضا میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔

پروفیسر شمیم انور کا مقالہ انگریزی میں تھا۔ بڑا ہی علم افروز، فکر انگیز اور بلیغ تھا یہ مقالہ۔ اس میں مرد کے عورت پر تغلب حاصل کرنے کے پسِ منظر کا تجزیہ کیا گیا تھا۔ اور نظامِ بوہیت کے قیام کو ایک حد تک اس کا حل قرار دیا گیا تھا، کیونکہ اس میں کوئی فرد دوسرے کا محتاج نہیں رہتا۔ اس کے بعد عیسائیت اور دیگر مذاہب کے عورت کی توہین میں خود تراشیدہ تصورات کی تفصیل پیش کرتے ہوئے بڑے بلیغانہ انداز میں اس قرآنی تصور کی وضاحت کی تھی کہ عورت اور مرد کے رابطِ باہمی سے ہی معاشرہ میں جنتِ ارضی کی وہ بساط بچھ سکتی ہے جس کا قرآنی نظام مدعی ہے انھوں نے طاہرہ بہنوں سے اپیل کی کہ آج اس نظام کے قیام کے سلسلہ میں ان پر مردوں سے بھی زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآنی نظام کو بروئے کار لا کر ہی وہ عملاً یہ ثابت کر سکیں گی کہ (عیسائیت کے غلط تصور کے مطابق) مرد کو جنت سے نکالنے والی عورت نہیں بلکہ وہ انسانی جنت آباد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

پروفیسر زاہدہ منظور نے بڑا "زوردار" مقالہ پیش کیا۔ بڑی جان تھی اس مقالہ کے بین السطور میں۔ اور بڑا زلزلہ انگیز تھا ان کا زورِ بیان۔ اس کی ایک ایک سطر میں گہری طنز تھی ہمارے غیر قرآنی معاشرہ کے نشیب و فراز اور عائلی زندگی کی بے راہ روی پر ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قرآن کے عطا فرمودہ مقام کو پا لینے کے بعد ملت کی غیور طاہرہ بیٹی ان زخموں کو کرید رہی ہے، جو دینِ ملا کی خود ساختہ شریعت نے گزشتہ صدیوں میں مسلسل صنفِ نازک کو لگائے تھے۔ مذہب کے مقدس نقاب میں یہ ظلمِ عظیم روا رکھنے والوں کو یقیناً مظلومی کی ان تلخ نوائیوں کو گوارا کرنا پڑیگا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان مقالات میں قرآنی حدود کا اس قدر خیال رکھا گیا تھا کہ جذبات کی شدت میں کہیں ایک قدم بھی ان سے متجاوز نہ ہونے پایا اور اس کا سامعین پر بڑا گہرا اثر ہوا۔

محترمہ ثریا عندلیب، شمعِ قرآنی ہاتھ میں لئے مائیک پر آئیں اور اس روشنی میں "عورت کا مقام" قرآنی خطوخال میں مجلس کے سامنے واضح کر کے رکھ دیا۔ "طلوعِ اسلام نے اپنے قرآنی فکر سے طاہرہ بیٹیوں کے قلب و نگاہ کو بنا دیئے کس حد تک اُن کے حقیقی رُخ کی طرف بدل دیئے ہیں۔ یہ بصیرت افروز خطاب دراصل اسی حقیقت کا آئینہ دار تھا۔ محترمہ بہن ثریا عندلیب، قدم قدم پر اپنی راہ آیاتِ قرآنی سے منور کئے جا رہی تھیں۔

ثریا عندلیب کے بعد محترمہ سکندرہ بیگم ڈاکٹر ریاض کا مقالہ تھا۔ "والدین اور بچوں کی تربیت" ان کا موضوع تھا وہ ناسازیٔ طبیعت کی بنا پر شریکِ محفل نہ ہو سکیں۔ ان کا مقالہ شائع ہو رہا ہے۔

محترمہ سکندرہ بیگم کے بعد پروفیسر سعیدہ اختر تشریف لائیں۔ تصورات کی گہرائیوں میں گم تھیں اور قرآنی بصیرت سے مالا مال۔ سعیدہ بہن درحقیقت اس مقامِ بلند پر فائز ہیں جس کے پیشِ نظر اقبال کے الفاظ میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ

در خطِ سیمائے تو تقدیرِ ما

اسی مقام سے محترمہ سعیدہ اختر نے اس ذہنی اور نفسیاتی انقلاب کی تفصیل پیش کی جو 'طلوعِ اسلام' کی بدولت ان کی زندگی میں رُونما ہوا۔ اس سے قبل متوارث مذہبی معتقدات نے انہیں کن خوش فہمیوں میں مبتلائے فریب کر رکھا تھا۔ اور قرآنی فکر کی روشنی انہیں کس طرح خود فریبی اور خدا فریبی کے ان اندھیروں سے نکال کر حقائق کی روشنی میں لے آئی۔ یہ ایک آپ بیتی تھی، اس طاہرہ بہن کی۔ لیکن اس آپ بیتی کو جس دل نشین پیرایہ میں انہوں نے پیش کیا، وہ کچھ انہی کا حصہ تھا۔ اندازِ بیان کی سادگی اور بے ساختگی، سیدھے سادے الفاظ کی روانی میں جگمگاتے ہوئے حقائق کے گہر ہائے آبدار۔ یہ سب کچھ قلب و نظر کی گہرائیوں تک چکا چوند پیدا کر گیا۔

سب سے آخر میں محترمہ پروفیسر حمیدہ جہاں خواجہ، وائس پرنسپل میکلیگن ٹریننگ کالج مائیک پر آئیں ——— طاہرہ بہنوں کی قافلہ سالار، حمیدہ جہاں خواجہ۔ جن کا عزمِ صمیم اس کاروانِ شوق کے لئے ہمیشہ بانگِ جرس کا کام دیتا ہے ——— محترمہ خواجہ بہن، عائلی ضوابط سے متعلقہ آرڈیننس کے خیر مقدم کے سلسلہ میں ایک اہم قرارداد لیکر تشریف لائیں (قرارداد روئیداد کے آخر میں دیکھئے)۔ قرارداد کی وضاحت پیش کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ مرد کے احساسِ برتری نے معاشرہ کا توازن بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔ اور ہم میں سے کسی کو احساس تک نہیں کہ زندگی کے ہر چہار ضروری مسائل ——— پیدائش، پرورش، تربیت اور تعلیم ——— ہمیں کن فرائض کی ادائیگی کی دعوت دیتے ہیں۔

عائلی قوانین کی مختلف دفعات کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ان قوانین کی کامیابی کے لئے معاشرہ میں ذہنی تربیت اور فکری انقلاب کی اشد ضرورت ہے۔ جب تک ہم خود اپنے اندر نفسیاتی تبدیلی پیدا نہیں کریں گے، محض قوانین کے ذریعے معاشرہ جنت در آغوش نہیں بن سکیگا۔ زندگی کو ان خوشگواریوں سے ہم آغوش کرنے کے لئے مردوں اور عورتوں سب پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرنے سے ہی معاشرہ میں حسنِ توازن قائم ہوگا اور آئندہ نسلیں زندگی کے صحیح سانچوں میں ڈھل سکیں گی۔

محترمہ حمیدہ جہاں خواجہ کی طرف سے پیش کردہ قرارداد کی منظوری سے یہ اجلاس ختم ہوگیا لیکن کنونشن ہاؤس ہمیشہ کیلئے اپنے یادگار نقوش چھوڑ گیا۔ طلوعِ اسلام کنونشن، بجا طور پر یہ حق رکھتی ہے کہ اس اجلاس کے خوش آئند اور دور رس نتائج پر فخر کرے۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ صدیوں کے فکری جمود کی راکھ میں دبی ہوئی چنگاریاں شعلہ جوالہ کی صورت اختیار کرتی دکھائی دیں۔ نشید قرآنی کی وہ آواز جو دھیمے دھیمے سُروں میں چند گھرانوں کی چار دیواری میں محدود تھی ایک نفیر انقلاب بن کر فضاؤں میں مرتعش ہوتی۔ وہ زبانیں جنھیں جذبۂ تغلب اور احساسِ برتری کی مذموم ستمکاریوں نے مدتوں سے مُہر بلب کر رکھا تھا، اب ان کی مُہرِ سکوت ٹوٹ رہی تھی، اور وہ اپنے اُن حقوق کی بازیابی کے لئے جو خدا کی بارگاہ سے اُنھیں حضور رحمۃ للعالمینؐ کی وساطت سے عطا کئے گئے تھے "ہل من مبارز" کا نعرہ بلند کر رہی تھیں۔ لیکن پوری ذمہ داری اور

خاتمۂ اجلاس پر پرویز صاحب کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو تھے اور وہ احباب کے حلقہ میں محصور عالمِ وارفتگی میں پکار رہے تھے

"خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ میری عمر بھر کی عرق ریزیاں رائگاں نہیں گئیں، مجھے آج اپنی جگر کاویوں کا صلہ مل گیا"

مجلسِ استفسارات

۸ اپریل کی رات کی نشست مجلسِ استفسارات کے رنگ میں تھی۔ ہمیشہ کی طرح زندگی کے اہم ترین عملی مسائل کے بارے میں اہم ترین سوالات اور مفکرِ قرآن کی زبان سے قرآنی فکر و بصیرت کی روشنی میں ان کے نکھرے نکھرے جوابات۔ اعلان کے مطابق تمام سوالات تحریری صورت میں آغازِ اجلاس سے قبل پرویز صاحب کی خدمت میں پہنچا دیئے گئے تھے اور جب مولانا عبدالرحیم خاں (پنڈ دادن خاں) کی صدارت میں اجلاس شروع ہوا تو تلاوتِ کلامِ پاک اور خلیل مرزا کی نظم کے بعد پرویز صاحب پلیٹ فارم پر تشریف لائے۔ حسبِ سابق اس مرتبہ بھی بڑے اہم سوالات سامنے آئے۔ تقدیر کا قرآنی مفہوم کیا ہے؟ دعا سے کیا ہوتا ہے؟ منصبِ نبوت کے لئے خدا کا قانون کیا ہے؟ کمیونزم کے مقابلہ میں اسلام کی امتیازی حیثیت کیا ہے؟ حلت و حرمت کا قرآنی فلسفہ کیا ہے؟ قرآن کس طرح زندگی کے ہر گوشے میں اصولی راہ نمائی دیتا ہے؟ رسولِ اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ کس طرح ساری دنیا کے لئے قندیلِ راہ ہے؟ (وغیرہ وغیرہ) یہ تھے وہ اہم سوالات، جن کے جوابات مفکرِ قرآن نے اپنے مخصوص بلیغانہ انداز میں شروع کئے۔ قرآنی فکر و بصیرت کی جوئے رواں نے عراقِ دلنشیں کے ساز چھیڑ دیئے اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا

پھر سے نغموں کے تار ملتے ہیں
پھر سے شاخوں پہ پھول کھلتے ہیں

سکوتِ نیم شبی تک نغموں کے یہ تار حرکت میں رہے۔ فکر و بصیرت کی شاخیں پھول برساتی رہیں۔ مسائلِ زندگی کے اہم ترین گوشوں کی نقاب کشائی ہوتی چلی گئی۔ قلب و نگاہ کی الجھنوں میں نکھار پیدا ہوتا گیا۔ قرآن کا طالبِ علم کس مقامِ بلند سے کاروانِ حیات کی گذرگاہوں کا جائزہ لیتا ہے؟ اس کی عقابی نگاہ کس طرح زندگی کی کٹھن راہوں کا اندازہ اور پُرخطر گھاٹیوں کی نشاندہی کرتی ہے؟ کس نکھرے ہوئے انداز میں مختلف گتھیوں کو سلجھاتی ہے؟ یہ مجلس ان سوالات کا جیتا جاگتا جواب بن رہی تھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ ایوان کی پوری فضا پر ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا۔ کوئی بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ مجلس برخاست ہو، بلکہ دلوں سے برملا دعائیں اُبھر رہی تھیں کہ

دلچسپ ہو گئی ہے پریشانیٔ حیات — اے زلفِ عنبریں تری الجھن دراز ہو

محفلیں جمتی ہیں اور پھر اٹھ جاتی ہیں اور اس طرح پھر بار بار جمتی ہیں۔ اس محفل کو بھی بالآخر اٹھنا پڑا۔

آخری اجلاس

۹ اپریل کی صبح، آخری اجلاس کی آئینہ دار بن کر طلوع ہوئی۔ یہ اجلاس شیخ محمد شفیع صاحب (کراچی) کی صدارت میں ۹ بجے شروع ہوا۔ اس اجلاس میں پرویز صاحب کا اہم خطاب سامنے آنا تھا۔ جس کا عنوان تھا

"فردوسِ گم گشتہ"

(جس کی تلاش میں یورپ مارا مارا پھرتا ہے)

پرویز صاحب کا خطاب تلاوتِ کلامِ پاک اور خلیل صاحب کی نظم کے بعد پرویز صاحب نے اپنا علم آرا خطاب شروع کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے یورپ میں مروجہ مذہب عیسائیت کے متعلق وہاں کے اربابِ بصیرت کا ردِّ عمل پیش کیا۔ اور واضح کیا کہ ان عظیم مستشرقینِ مغرب کے نزدیک عیسائیت "شکست خوردوں کا مذہب" قرار پا چکی ہے۔ پھر انھوں نے عیسائیت (اور خود نفسِ مذہب) کے خلاف اس شدید ردِّ عمل کا تجزیہ کیا جو مادی تصوّرِ حیات کی صورت میں وہاں رائج العام ہوا اور تہذیبِ مغرب کی موجودہ ترقی یافتہ صورت میں برگ و بار لایا۔

تہذیبِ مغرب، اخلاقیات، سیاسیات، معاشیات اور زندگی کے دیگر اہم شعبوں میں کس قدر ہلاکت خیزیاں لیکر آئی، اس کی تفصیل بھی مفکرِ قرآن نے مفکرینِ مغرب کی شہادتوں سے پیش کی۔ اور ان کی وہ چیخ و پکار اور نالہ و فریاد بھی، جو ہلاکت خیزیوں کے اس سیلاب میں سنائی دے رہے ہیں۔

یورپ کو اب کس قسم کے مذہب کی تلاش ہے اور اسلام کس حسن و خوبی سے اُن کے یہ تقاضے پورے کر سکتا ہے؟ یہ تھا پرویز صاحب کے موضوع کا گوہرِ مقصود۔ اور قرآنی فکر کی جس قوتِ استقلال سے وہ اسے ایوان کے سامنے لائے وہ انہیں کا طرۂ امتیاز ہو سکتا ہے۔ کسی دوسرے کا نہیں۔ انھوں نے بدلائل و براہین اور علیٰ رؤس الاشہاد، اس حقیقتِ تابندہ کی نشاندہی فرمادی کہ یورپ جس جدید نظام کی تلاش میں مضطرب اور سرگرداں ہے، وہ اُسے قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔ (یہ خطاب اسی اشاعت میں شامل ہے)

آخری قراردادیں پرویز صاحب کے خطاب کے بعد، محترم مولانا عبد الرب صاحب نے نصابِ تعلیم کی تشکیلِ نو سے متعلق قرارداد پیش کی۔ ان کے بعد راقم الحروف، محترم چوہدری عبد الرحمٰن اور محترم شیخ محمد شفیع صاحب (صدرِ اجلاس) نے بالترتیب، شرکائے کنونشن، رضاکاران اور صدرِ کنونشن

کمیٹی کے لئے اظہارِ تشکر اور کنونشن کی نمایاں کامیابی سے متعلق قرار دادیں پیش کیں۔ اور ان کے بعد شیخ گلزار حسین کی یہ قرار داد سامنے آئی کہ ریڈیو پاکستان پر طلوعِ اسلام کی پیش کردہ قرآنی تعلیمات کی نشر و اشاعت سے ملک کو اسلامی نظام کی تربیت گاہ بنایا جائے۔ ایوان نے بالاتفاق رائے ان قراردادوں کو منظور کر لیا۔ (مذکورہ قرار دادیں روئیداد کے آخر میں دیکھئے)

آئندہ سب کنونشن کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ وہ سرگودھا میں ہوگی۔ اور تاریخوں کا تعین بعد میں ہوگا۔

الوداعی مجلس

آخری اجلاس کے اختتام سے کنونشن کا باضابطہ پروگرام بھی تکمیل پا گیا۔ اب وہ نازک لمحے سامنے تھے جو زبانِ حال سے پکار رہے تھے کہ:۔

غنیمت جان لو مل بیٹھنے کو
جدائی کی گھڑی سر پر کھڑی ہے

چنانچہ آخری اجلاس ختم ہونے پر بھی ایوان میں سے کوئی اپنی جگہ سے حرکت پر آمادہ نہ ہو سکا۔ کوئی بھی مل بیٹھنے کی ان ساعتوں سے محروم ہونے پر رضامند نہیں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں احباب کے چہرے حزن و ملال کی تصویر بن گئے تھے۔ جدائی کے تصور نے ان کے جذبات و احساسات میں الم انگیز کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ذہنی اور نفسیاتی تغیر کا یہ ملال آگیں مرحلہ پورے پنڈال، بلکہ پورے کنونشن ہاؤس کی فضا میں اُداسیاں پیدا کر چکا تھا۔ ایوان پر گہری خاموشیاں طاری تھیں اور نگاہوں سے ایک عجیب حسرت سی ٹپک رہی تھی

جہاں مے کے چھینٹے مسرت فشاں تھے
اُسی بزم میں اشکِ غم بھی رواں ہیں

یہ تھا وہ ماحول جس کی فضائے سوز ناک میں میر کارواں تخاطبِ شیریں کو ہاتھ میں لئے مائیک پر نمودار ہوئے۔ سرِ روزہ پروگرام کی رفتار میں شاید یہ پہلا اور نازک ترین مرحلہ تھا جب اس الوداعی رسم کی ادائیگی میں زبان ان کے احساسِ غم کی ترجمانی میں اظہارِ عجز کر رہی تھی۔ اور الفاظ ان کا ساتھ دینے میں پس و پیش کر رہے تھے۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے وہ کچھ دیر اپنے، زندگی اور موت کے ساتھیوں پر نگاہ جمائے رہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ ان کے لبوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ پنڈال میں اب ان کی تھرتھراتی ہوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اور وہ ممکنات زندگی کی نقاب کشائی کر رہے تھے۔

الوداعی پیغام

برادرانِ عزیز!

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

تو سال بھر کے انتظار کے بعد آپ آتے ہیں تو ایک ایک قدم سے میری قسمت کے ستارے روشن ہوتے جاتے ہیں۔ تین دن، کن خوشیوں کے ہجوم میں گزرتے ہیں۔ اور پھر جب رخصت کا وقت آتا ہے تو ایک جانگداز سی کیفیت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن! یہ جانا بھی تو ضروری ہو جاتا ہے۔ تاکہ آپ پھر آئیں تو مسرتوں سے بھرے ہوئے دامن سمیٹتے آئیں۔ آپ جو نقوش اس فضا میں چھوڑ جاتے ہیں وہ میرے لئے سال بھر کا فی سامانِ طمانیت اپنے اندر رکھتے ہیں۔ یہ نقوش دل کی زمینوں میں مرتسم ہوتے ہیں اور سال بھر آپ کی یاد تازہ کرتے اور مجھ سے گویا باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اس موقعہ پر میں آپ کو کونسا الوداعی پیغام دوں؟ اب آپ ایک مجسم پیغام بن چکے ہیں۔ آخری پیغام ایک ہی ہو سکتا ہے ——— وہی پیغام جو دینے والے نے (روحی فداہ) آخری بار سب کو دے دیا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا پیغام اور کیا ہو سکتا ہے؟ ——— وہ پیغام بہار اور نویدِ جشنِ نوروز جسے اگر عام کر دیا جائے تو صحنِ چمنِ عالم کی کلی کلی متبسم ہو جائے۔ اس پیغام کو عام کرنے کی جدوجہد جاری رکھئے۔ اور اب تو

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا

آپ کی جدوجہد کے نتائج محسوس و مشہود طور پر منظرِ عام پر آ رہے ہیں، اور آپ کی کوششوں سے فضا دن بدن نشیدِ قرآنی سے معمور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ابھی اور کتنی سعادتیں ہیں، جو ہماری قسمت میں لکھی ہیں۔ یقین رکھئے کہ یہ سب کچھ ہو کر رہے گا۔ کوئی طاقت اب اسے روک نہیں سکتی۔ اس کے باوجود یہ آپ کا فریضہ ہے کہ ایک ایک لمحہ کی قیمت کو سمجھئے۔ زمانہ کرب و اضطراب سے کروٹیں بدل رہا ہے۔ اور اگر پاؤں سے کانٹا نکلنے کے تقاضے سے ذرا بھی رکے تو وہ روندتا ہوا گذر جائے گا۔ اس لئے ایک ایک لمحہ کو جاودانی سمجھئے۔ نہیں بلکہ سورج کی کرنوں سے اپنے لئے کچھ اوقات ادھار مانگ لیجئے۔ یہ ہماری سعادت بختی ہے کہ ہم سے کسی بڑی قربانیوں کا مطالبہ نہیں کیا گیا، ورنہ اس راہ میں تو پہلا قدم ہی بدر کا میدان ہوتا ہے"

الوداعی پیغام سے فارغ ہونے کے بعد پرویز صاحب سٹیج سے نیچے آئے اور باری باری احباب سے گلے ملنے لگے۔ اور اس کے بعد بزمِ قرآنی کے یہ طائرانِ پیش رس، مخلصانہ آرزوؤں کے جلو میں ایک دوسرے سے رخصت ہونے لگے ستاروں کی انجمن آہستہ آہستہ بکھرتی چلی گئی۔ اور جب آفتاب اپنے نصف النہار سے آگے بڑھا تو اس کی نگاہیں کنونشن ہاؤس کی رونقوں کو ٹوٹتے دیکھ رہی تھیں، جہاں تین دن اور تین راتیں مسلسل نشیدِ قرآنی سے لالہ و گل کی فضا جھومتی رہی، وہاں اب گہری خاموشیاں طاری ہوتی جا رہی تھیں۔ کنونشن کمیٹی کے صدر، اور کنونشن ہاؤس کے زندہ دل میزبان جس کے چہرے پر ہمیشہ ایک مسکراہٹ سی کھیلتی نظر آتی ہے، اب [illegible] اور اداس اداس سا دکھائی دیتا تھا۔ اب وہ سال بھر ان انوکھے مہمانوں اور زندگی کے ساتھیوں کا انتظار کریں گے۔ [illegible] آئندہ موسمِ بہار اور جشنِ نزولِ قرآن کے ساتھ پھر خیر مقدم کی تیاریوں میں لگ جائیں گے۔

کنونشن ہاؤس کے میزبانو! اور بزمِ قرآنی کے ہمصفیرو!! تم سب پر سلام ہو کہ تمہارے ربطِ باہمی اور ذوقِ سفر

کے صدقہ میں آج قرآنی صبحِ انقلاب کی کرنیں، قدامت پرستی کی تاریکیوں اور سازشِ تہم کی چلمنوں سے اُبھر اُبھر کر پاکستان کی فضائے بسیط میں پھیلتی چلی جا رہی ہیں۔ ہم نے دیارِ عشق میں اپنے مقام کا تعین کر لیا، اور ایک نیا زمانہ اور نئے شام و سحر تھامے قدم لینے کو آگے بڑھ رہے ہیں۔ مبارک ہوں زندگی کی یہ کامرانیاں اور سعد گھڑیاں جن پہ تاریخ ناز کرے گی لعد

آنے والا وقت لکھے گا کہانی اک نئے مضمون کی

قراردادیں

قرارداد ۱ = بسلسلۂ تعزیت حاجی فقیر محمد خاں (مرحوم)

محرک ـــــــ ڈاکٹر عبدالحکیم خاں ـــ ۷ر اپریل (نشستِ اوّل)

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس قرآنی فکر کے شیدائی اور سرگرم مبلغ محترم حاجی فقیر محمدؐ خاں مرحوم کے حرکتِ قلب بند ہونے سے اچانک انتقال پر دلی رنج و ملال کا اظہار کرتا ہے اور بارگاہِ ربّ العزت میں دعا کرتا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

قرارداد ۲ = بسلسلۂ لغات فنڈ

محرک ـــ ڈاکٹر عبدالحکیم خاں (مردان) ـــ ۸ر اپریل (نشستِ اوّل)

ہرگاہ کہ طلوعِ اسلام کنونشن راولپنڈی نے لغات القرآن اور مفہوم القرآن کی طباعت کے لئے ایک فنڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اور ناظم ادارہ طلوعِ اسلام کی رپورٹ کے مطابق اس فنڈ میں ۴۳,۲۶۱/۰۲ روپے جمع ہوئے تھے اور ہرگاہ کہ کنونشن کی خواہش کے مطابق، قرآنی احباب کی اس پیش کش کو بطورِ عطیہ قبول کرنے کے بجائے ادارہ نے اُسے کنونشن سے بطورِ امانت اپنی تحویل میں لیا تھا۔ اب یہ فنڈ لغات القرآن کی جلدوں کی تیاری میں صرف ہو چکا ہے، اور ادارہ کی طرف سے اس فنڈ کے برابر قیمت کی جلدیں میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کے سپرد کر دی گئی ہیں۔ بنا بریں طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ سے درخواست کرتا ہے کہ مذکورۂ بالا فنڈ کا جو روپیہ اس کے پاس کتابوں کی شکل میں بقایا ہے، اُسے اب وہ مفہوم القرآن کی طباعت میں استعمال کرے، اور کوشش کرے کہ اس کے اردو ایڈیشن کی تکمیل کے بعد انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو۔ اور ازاں بعد ان کی فروخت سے جو روپیہ جمع ہوتا جائے اس کی رپورٹ ادارہ کی وساطت سے طلوعِ اسلام کنونشن میں پیش کرے تاکہ کنونشن اس کے آئندہ مصرف کا فیصلہ کرنے کے قابل ہو سکے۔ اس سلسلہ میں یہ اجلاس ضروری سمجھتا ہے کہ اس دوران لغات القرآن اور مفہوم القرآن کی اشاعت و فروخت وغیرہ کے

سلسلہ میں میزان پبلیکیشنز کی طرف سے جو اقدامات کئے جائیں، ان کی رپورٹ بھی ادارہ کی طرف سے کنونشن کے سالانہ اجلاس میں پیش کی جائے۔

(نوٹ)۔ میزان پبلیکیشنز کی نمائندگی کرتے ہوئے میں تصدیق کرتا ہوں کہ ادارہ کی وساطت سے کنونشن کی امانت مبلغ ۴۲,۲۶۱/۰۲ روپے کی رقم کتب یعنی لغات القرآن کی شکل میں منتقل ہو چکی ہے۔ اور اس کی تحویل میں ہے، اور آئندہ حسب ہدایت دوسرے مصرف میں لائی جائے گی۔ (دستخط) چوہدری عبدالرحمٰن مینجنگ ڈائرکٹر۔

قرارداد ۳ = بسلسلہ تشکیلِ نو مجلس عاملہ طلوع اسلام

محرک ۔ چوہدری عبدالرحمٰن (لاہور) (بہ تجویز مرزا علی اخلاص پشاور) ۔ ۸ اپریل (نشست اوّل)

طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس بڑھائے طلوع اسلام کے نظم وضبط اور دیگر امور کی نگرانی کے سلسلہ میں مجلسِ عاملہ کی تشکیلِ نو کا فیصلہ کرتا ہے، اور اس کے اساسی ضابطے کے طور پر حسب ذیل امور طے کرتا ہے۔

(۱)۔ ہر بزم کا نمائندہ، بلحاظِ عہدہ، مجلسِ عاملہ کا رکن قرار پائے گا۔

(۲)۔ عملی کام کی سہولت کے لئے اس کا مرکز لاہور میں ہوگا، کیونکہ ادارہ طلوع اسلام بھی لاہور ہی میں ہے۔

(۳)۔ مجلس عاملہ کا مرکز لاہور میں ہونے کی بنا پر بزم لاہور کا نمائندہ، بلحاظِ عہدہ، مجلس کا صدر ہوگا، اور اپنی امداد کے لئے حسب ضرورت ارکان پر مشتمل اپنے رفقا میں سے ایگزیکٹو کمیٹی کا قیام عمل میں لائے گا جو مجلس عاملہ کے لئے عملی پروگرام مرتب کریگی۔ اور ادارہ کے زیر ہدایت اسے بروئے کار لائے گی۔

(۴)۔ مجلسِ عاملہ کے اراکین ایگزیکٹو کمیٹی کے سامنے جواب دہ ہوں گے اور ایگزیکٹو کمیٹی ادارہ کے سامنے جواب دہ ہوگی۔

(۵)۔ ہر سال سالانہ کنونشن اور سب کنونشن کے موقعہ پر مجلس عاملہ کے دو اجلاس ہوں گے۔

قرارداد ۴ = بسلسلہ قیام میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

محرک ۔ حافظ برکت اللہ صاحب (کراچی)۔ ۸ اپریل (نشست اوّل)

طلوع اسلام کنونشن کا یہ اجلاس میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کے قیام کو مستحسن اقدام تصور کرتا ہے۔ اور توقع رکھتا ہے کہ طلوع اسلام کی قرآنی برادری اس کے ساتھ پورے تعاون سے کام لیگی۔ مزید برآں یہ اجلاس ان احباب کی خدمت میں جنہوں نے جذبۂ خلوص و ایثار سے کام لیتے ہوئے اس ادارہ میں حصہ لیا، ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

قرارداد ۵ = بسلسلۂ طباعت و اشاعت لغات القرآن

محرک۔ چوہدری عبدالرحمٰن صاحب (لاہور) ۸ اپریل (نشستِ اوّل)

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس ادارہ طلوعِ اسلام کی خدمت میں بہ خلوصِ قلب ہدیۂ تحسین و تبریک پیش کرتا ہے کہ مسلسل جانفشانی اور عرق ریزی سے اس نے ایک سال کی مختصر مدت میں لغات القرآن کی چاروں جلدیں اس حُسنِ اہتمام سے شائع کیں جس کی مثال بہت کم ملے گی۔ ادارہ کی ان مبارک کوششوں سے قرآن کے زندۂ جاوید حقائق کو سمجھنے میں آسانیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ خدا ان کا کما حقہٗ اجر عطا فرمائے۔

قرارداد ۶ = ہدیۂ تبریک بخدمت صدرِ مملکت بسلسلۂ نفاذِ عائلی آرڈیننس

محرک۔ پروفیسر حمید جہاں خواجہ ۔۔۔۔ ۸ اپریل (نشستِ دوم)

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس، صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے کہ موصوف نے عائلی کمیشن کی بعض سفارشات کو قانونی حیثیت دینے کا آرڈیننس جاری فرما کر یتیم پوتے، نواسے وغیرہ کا حق تسلیم اور مسلم خواتین کو ان کے قرآنی حقوق دینے کی بنیاد ڈالدی ہے، اور اس آرڈیننس کے ذریعہ اسلام کی تاریخ میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا ہے۔ یہ اجلاس درخواست کرتا ہے کہ :-

(۱)۔ آرڈیننس کی جُزئیات جلد از جلد مرتب اور نافذ کی جائیں، اس طرح کہ ان میں کوئی بات قرآنی منشاء کے خلاف نہ ہو۔

(۲)۔ مجوزہ قوانین میں قرآنی منشاء کی رُو سے جو کمی یا کمزوری رہ گئی ہے، اُسے پوری اور رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔

(۳)۔ مذہب اور سیاست کی ثنویت کو جس نے مذہبی پیشوائیت کو متوازی حکومت کی حیثیت دے رکھی ہے، ملک میں قرآنی نظام نافذ کر کے بہت جلد ختم کیا جائے۔ حکومتِ پاکستان نے رویتِ ہلال کمیٹی کے متعلق جو حال ہی میں فیصلہ کیا ہے، وہ اس سلسلہ میں پہلا قدم ہے۔ کنونشن کا یہ اجلاس حکومت کو اس فیصلہ پر مبارکباد دیتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ وہ اسے ملک میں بطورِ قانون نافذ کرے، اسے اس کا ماننا یا نہ ماننا لوگوں کی صوابدید پر نہ چھوڑے۔

قرارداد ۷ = بسلسلۂ نصابِ تعلیم

محرک ۔۔ مولانا عبدالنبی صاحب (کراچی) ۔۔۔ ۹ اپریل (آخری نشست)

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس اس پختہ یقین کے ساتھ کہ پاکستانی سوسائٹی کے مختلف طبقوں میں کردار کی کمی کا واحد علاج تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے، تجویز کرتا ہے کہ۔

(۱)۔ نصابِ تعلیم کی تشکیل کو، جو اس وقت حکومت کے زیرِ غور ہے، قرآن کے غیر متبدل اصولوں اور وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار پر استوار کیا جائے۔

(۲)۔ ادارۂ طلوعِ اسلام، طلباء و طالبات کے لئے ایسی مثالی تعلیم گاہ کے قیام کو زیرِ غور لائے جو قرآنی تعلیمات کی آئینہ دار ہو۔

قرارداد نمبر ۸ = بسلسلۂ تبریک و تشکر شرکائے کنونشن

محرک۔ صفدر سلیمی صاحب (لاہور)۔ ۹ اپریل (آخری نشست)

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس کنونشن کی نمایاں کامیابی پر جملہ برادرانِ طلوعِ اسلام، نمائندگان و دیگر احباب کو مبارکباد پیش کرتا ہے اور اُن کے پُرخلوص تعاون کے لئے شکر گذار ہے۔

قرارداد نمبر ۹ = بسلسلۂ تشکر رضاکاران

محرک۔ چوہدری عبدالرحمٰن صدر کنونشن کمیٹی۔ ۹ اپریل (آخری نشست)

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس اپنی اور کنونشن کمیٹی کی طرف سے ان تمام رضاکار حضرات کا دلی شکریہ ادا کرتا ہے جنھوں نے شبانہ روز محنت و مستعدی سے اپنے فرائض کو بحُسن و خوبی سرانجام دیا۔

قرارداد نمبر ۱۰ = بسلسلۂ تبریک کنونشن کمیٹی و معاونین

محرک۔ شیخ محمد شفیع صاحب (صدرِ اجلاس) ۔ ۹ اپریل (آخری نشست)

طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس کنونشن کے، روحِ رواں، چوہدری عبدالرحمٰن صاحب صدر کنونشن کمیٹی اور ان کے جملہ رفقائے کار و معاونین کی خدمت میں کنونشن کے اعلیٰ انتظامات پر دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہے۔

قرارداد نمبر ۱۱ = طلوعِ اسلام کی پیش کردہ قرآنی تعلیمات ریڈیو پاکستان پر

محرک۔ شیخ گلزار حسین (کراچی)۔ ۹ اپریل (آخری نشست)

ہر گاہ کہ حصولِ پاکستان کا مقصدِ وحید ایک ایسی اسلامی مملکت کی تشکیل تھا جو قرآنی نظامِ معاشرہ کی تجربہ گاہ

قرار پاسکے۔ اور ہرگاہ کہ کارفرمایانِ مملکت اس حقیقت کی مسلسل تائید کرتے چلے آرہے ہیں۔ اور ہرگاہ کہ قرآنی تعلیمات اور قرآنی تصورِ حیات کی وضاحت میں قیامِ پاکستان سے قبل اور اس کے قیام کے بعد طلوعِ اسلام ہمیشہ پیش پیش رہا ہے۔ طلوعِ اسلام کنونشن کا یہ اجلاس حکومتِ پاکستان سے پُرزور درخواست کرتا ہے کہ اس مقصدِ عظیم کی بجا آوری کیلئے جملہ ذرائع کماحقہٗ بروئے کار لائے جائیں اور طلوعِ اسلام کی پیش کردہ قرآنی تعلیمات و تصورات کو ریڈیو پاکستان کی وساطت سے نشر کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں۔

عنایت اللہ

کے نام سے اب آپ نا آشنا نہیں

"آخری سہارے" ــــ آپ طلوعِ اسلام میں دیکھ چکے ہیں۔
"دھتکارے ہوئے انسان" ــــ اسی اشاعت میں آپ کے سامنے ہے۔
جس کتاب کا اس مضمون (بلکہ تقریظ) میں ذکر ہے، عنایت صاحب نے اُسے مکمل کر دیا ہے۔
وہ عنقریب میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کی طرف سے پیش کی جائے گی۔

جیل کی سلاخوں

کے اندر بسنے والی دنیا کے عبرتناک، خونچکاں، حیرت انگیز، ناقابلِ تسلیم حالات۔ طلسمِ ہوشربا کی طرح دلچسپ، لیکن نہایت سبق آموز۔

اسی ماہ شائع ہو جائیگی

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔ بی ــــ شاہ عالم مارکیٹ ــــ لاہور

اِستقبالیہ

— محترم چوہدری عبدالرحمٰن صاحب صدر کنونشن کمیٹی

برادرانِ گرامی قدر! سلام و رحمت۔

غالبؔ نے کہا تھا۔

چاک مت کر جیب بے ہنگامِ گُل
کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہئے

میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے اس اجتماع کے لئے "اُدھر سے" اشارہ ہی نہیں ہوتا بلکہ دعوت نامہ بھی ملتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ بہار کا موسم، جس میں زندگی پورے جوش پر ہوتی ہے، اس پر عید کا مہینہ جو جشنِ نزولِ قرآن کا مہینہ ہے، اور ایسے موقعہ پر ہمارا یہ اجتماع، جس میں خدا کی زندہ و پائندہ کتابِ عظیم کا سودا سر میں رکھنے والے احبابِ ملک کے دور دراز گوشوں سے چل کر اس مقصد کے لئے مل بیٹھیں کہ اس ضابطۂ خداوندی کے حیات بخش پیغام کو کس طرح عام کیا جائے۔ جس قدر یہ موسم خوشگوار اور یہ مہینہ مبارک ہے، اُسی قدر ہماری یہ تقریب بھی شاداب اور بابرکت ہے۔ میں اپنی طرف سے، اور لاہور کے جملہ قرآنی احباب کی طرف سے آپ کی خدمت میں دلی ہدیۂ خوش آمدید پیش کرتا ہوں۔

عزیزانِ محترم! ہمارا یہ پانچواں سالانہ اجتماع ہے۔ پہلا اجتماع اسی مقام پر نومبر ۱۹۵۵ء میں ہوا تھا۔ دوسرا اجتماع اکتوبر ۱۹۵۶ء میں راولپنڈی میں۔ پھر تیسرا اور چوتھا اجتماع اسی مقام پر اپریل ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں۔ اور اب ہم پانچویں مرتبہ پھر یہیں جمع ہو رہے ہیں۔ یہ بھی میری خوش بختی ہے کہ یہ مبارک اجتماعات میری قیام گاہ پر منعقد ہوتے ہیں۔

آپ نے راولپنڈی کنونشن میں مجھے کنونشن کمیٹی کا صدر منتخب کر کے ایک بہت بڑا بوجھ میرے کندھوں پر رکھ دیا تھا۔ میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ آپ نے میرے متعلق جو حسنِ ظن قائم کیا تھا، اُس کا بھرم قائم رکھ سکوں۔ لیکن مجھے اسکا احساس ہے کہ اس کے باوجود میں ابھی تک اس اجتماع کے انتظامات کو اس معیار تک نہیں لے جا سکا جو میں نے اپنے دل میں قائم کیا تھا۔ آپ حضرات کا تعاون شاملِ حال رہا تو یہ ایک دن اُس بلندی تک ضرور پہنچ جائے گا۔ خدا میری

اس آرزو کو بر لائے۔ سال گزشتہ کی طرح امسال بھی بیرونی بزموں کے رضا کار احباب انتظام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ میں ان بزموں کا۔ ان رضا کاروں کا، اور رضا کاروں کے کمانڈر محترم چوہدری نصر اللہ خاں صاحب کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔ رضا کاروں کا نشان سُرخ بیج ہے۔ آپ کو جو کچھ مطلوب ہو، یا کسی شکایت کا ازالہ مقصود ہو تو آپ ان سے کہہ دیجئے۔ یا براہِ راست مجھ سے۔

سال گزشتہ ہم نے چائے اور مشروبات کا الگ انتظام کیا تھا، جو ہماری ناتجربہ کاری کے باوجود کافی حد تک کامیاب رہا۔ امسال، سابقہ تجربہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس انتظام کو بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ رفیقِ محترم مرزا محمد خلیل صاحب اور ان کے برادرِ عزیز مرزا محمد جمیل صاحب اس انتظام کے نگراں ہیں۔ میں اپنی طرف سے، اور آپ تمام احباب کی طرف سے، ان کی رضا کارانہ خدمات کے لئے شکر گزار ہوں۔

۱۹۵۹ء کی کنونشن میں تجویز کی گئی تھی کہ کنونشن کمیٹی اگر شامیانے اور کرسیاں اپنی خرید لے تو اس سے اخراجات میں کافی بچت ہو جائے گی۔ سال گزشتہ (۳۱ مارچ) تک اس میں -/۱۱۲۵ روپے جمع ہوئے تھے۔ اس کے بعد (۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء) تک اس میں مزید -/۱۲۷۰ روپے موصول ہوئے۔ اس طرح اس مد کی کُل میزان -/۲۳۹۵ ہو گئے۔ چونکہ یہ رقم اس مقصد کے لئے بہت کم ہے، اس لئے طے یہ کیا گیا ہے کہ اس تجویز کو سرِ دست ملتوی رکھا جائے۔ اور اس رقم کو کنونشن کی آمدنی تصور کر لیا جائے۔ پچھلے سال اپنی رپورٹ میں میں نے عرض کیا تھا کہ ۱۹۵۹ء کی کنونشن کی آمد و خرچ کے بعد کنونشن کمیٹی مبلغ ۶—۳—۶۱۶ کی مقروض تھی۔ ۱۹۶۰ء کی کنونشن کے آمد و خرچ کا حساب حسبِ ذیل ہے:-

۱۔ آمدنی کنونشن:-	۰—۰—۱۵۴۵	خرچ کنونشن:-	۶—۵—۴۶۱۱
۲۔ آمدنی کرسیوں شامیانوں کے مد کی	۰—۰—۲۳۹۵	منہا کُل آمدنی:-	۰—۱۱—۴۲۳۵
		خسارہ:-	۶—۱۰—۳۷۵
۳۔ چائے کے اسٹال کی آمدنی	۰—۱۱—۲۹۵	سابقہ خسارہ:-	۶—۱۳—۶۱۶
	۰—۱۱—۴۲۳۵	کُل خسارہ:-	۰—۸—۹۹۲

(۹۹۲ روپے پچاس پیسے)

حیدر آباد کی سب کنونشن میں ایک مجلسِ عاملہ کے تقرر کا فیصلہ ہوا تھا۔ اس کی تفصیل محترم شیخ محمد شفیع صاحب اپنی رپورٹ میں پیش کریں گے۔ مجلسِ عاملہ نے یہ طے کیا ہے کہ کنونشن کے آمد و خرچ کی کفیل اور اس کے خسارے کی ذمہ دار مجلس ہو گی۔ اس لئے کنونشن کمیٹی اس خسارے کو مجلسِ عاملہ سے وصول کرے گی، اور آئندہ مجلسِ عاملہ ہی اس کے آمد و خرچ کی ذمہ دار ہو گی۔

سابقہ تجربہ نے بتایا ہے کہ ہنگامی مہمانوں کی وجہ سے انتظام میں بڑی خرابی اور اخراجات میں کافی زیادتی ہو جاتی ہے۔ ہنگامی

مہمانوں سے وہ احباب مراد ہیں جو کنونشن میں مہمانوں کی حیثیت سے تشریف نہیں لاتے لیکن کھانے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ چونکہ اس سے انتظام میں بڑی گڑبڑ ہو جاتی ہے، اور بے جا خرچ بڑھ جاتا ہے، اس لئے طے یہ کیا گیا ہے کہ اس دفعہ ہنگامی مہمانوں سے معذرت طلب کر لی جائے۔ میں آپ احباب سے بالخصوص درخواست کرونگا کہ آپ اس ضمن میں کارکنوں سے تعاون فرمائیں۔

اس مرتبہ کنونشن میں قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والی خواتین نے بھی شرکت کی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کے لئے ہمیں خاص طور پر الگ انتظام کرنا پڑا ہے، لیکن چونکہ ان بہنوں کی شرکت واجب ہزار سعادت و برکت ہے، اس لئے اس انتظامی اضافہ کو بخوشی گوارا کیا گیا۔ میں اپنی ان بہنوں سے برادرانہ التماس کرونگا کہ وہ اپنے آپ کو مہمان نہ سمجھیں بلکہ اس قرآنی برادری کی میزبان سمجھیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ان اجتماعات میں نہ کوئی مہمان ہوتا ہے نہ میزبان۔ یہ تمام بھائیوں اور بہنوں کا مشترکہ اجتماع ہے، جس کی کامیابی کے لئے سب کا تعاون ضروری ہے۔

حسبِ سابق نماز کے لئے یہی انتظام مناسب سمجھا گیا ہے کہ کنونشن سے متصل جامع مسجد میں نمازیں ادا کی جائیں، چونکہ ہمارا کوئی الگ فرقہ نہیں، اس لئے الگ نماز پڑھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تحریک کے سلسلہ میں اس سال کا سب سے اہم واقعہ میسرز ان پبلیکیشنز لمیٹڈ کا قیام ہے۔ چونکہ اس کمپنی کا مینجنگ ڈائرکٹر مجھے مقرر کیا گیا ہے، اس لئے اس کا تفصیلی تعارف بھی میرے ذمہ ہے، لیکن یہ تعارف کل جمع کی نشست میں پیش کیا جائے گا۔

جیسا کہ آپ احباب کو معلوم ہے کہ کل (ہفتہ کی) سہ پہر کی نشست عورتوں کے مسائل بالخصوص عائلی قوانین کے لئے مختص کر دی گئی ہے۔ اس میں بیشتر خواتین حصہ لیں گی۔ اگرچہ اجلاس سب کیلئے کھلا ہوگا، تاہم خواتین کے لئے پردہ کا خاص انتظام موجود ہے۔

آخر میں لاہور کے اُن تمام احباب کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جن کی دن رات محنت سے کنونشن کے انتظامات اس حد تک پہنچے ہیں۔ اگر ان کا تعاون میرے شریکِ حال نہ ہوتا تو میں اپنی اس ذمہ داری سے کبھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تھا۔

میں ایک بار پھر آپ احباب کی تشریف آوری کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ ہم جس مقدس اور عظیم مقصد کے لئے جمع ہوئے ہیں، اُس میں ہمیں کامیابی ہو۔ اور وہ مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ فرقہ یا سیاسی پارٹی بنائے بغیر قرآنی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ حد تک عام کیا جائے۔ والسلام۔

خریداروں سے!

رسالہ طلوعِ اسلام کے سلسلہ میں ہر قسم کی خط و کتابت براہِ راست ادارہ طلوعِ اسلام سے کیجئے۔ (ناظم ادارہ)

رپورٹ

(جو مولانا عبدالرب صاحب ناظم ادارہ طلوعِ اسلام نے طلوعِ اسلام کنونشن لاہور میں پیش فرمائی)

برادرانِ محترم!

گزشتہ کنونشن میں مارچ اپریل ۱۹۶۰ء کو لغات القرآن کی پہلی جلد پیش کرنے کی سعادت مجھے نصیب ہوئی تھی۔ انتہائی خوش

لغات القرآن

نصیبی ہے کہ گزرنے والے سال کے آخری دن، آج ۷ اپریل ۱۹۶۱ء کو لغات القرآن کی چوتھی اور آخری جلد پیش کرنے کا موقعہ بھی مجھے میسر ہے۔ ختم قرآن میں والناس کے فوراً بعد الحمد شروع کر دیا جاتا ہے۔ میں بھی لغت کی آخری جلد کے ساتھ ساتھ "مفہوم القرآن" کے سولہ

مفہوم القرآن

صفحے آپ کی خدمت میں نمونۃً پیش کرتا ہوں۔ اس خوش بختی پر میں جس قدر فخر محسوس کروں تھوڑا ہے۔

لغت کی دوسری جلد حیدرآباد کے کنونشن میں اکتوبر ۱۹۶۰ء میں پیش کی گئی تھی اور تیسری جلد جنوری ۱۹۶۱ء میں شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔

لغت کی تیاری میں برسوں صرف ہوئے۔ وسائل کی فراہمی میں پانچ سال لگ گئے۔ مگر دو ہزار صفحوں کی کتاب کی طباعت صرف ایک سال میں مکمل ہو گئی۔ یہ وہ کارنامہ ہے جس پر کارکنان بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔

برسوں کی کاوش کے بعد لغت تمام و کمال آپ کو مل چکی ہے۔ اور اس شدید انتظار کا خاتمہ ہو گیا ہے جو عرصہ دراز سے

لغت کا استعمال

آپ کو بے چین کئے ہوئے تھا۔ لغت کی تیاری اور اشاعت سے دو اہم مقاصد حاصل ہوئے ہیں۔ اوّل پرویز صاحب کے قرآنی مطالعہ کا خلاصہ اور نچوڑ صفحۂ قرطاس پر آ کر موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے محفوظ ہو گیا ہے، اور پورے یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لغت انسانیت کے لئے منافع کثیر کی انشاء اللہ ضامن ہو گی۔ دوسرے یہ کہ قرآن دوست احباب کو وہ نسخہ مل گیا ہے جس کے استعمال سے وہ قرآنی تعلیمات

کو بآسانی وجوہ سمجھ اور سمجھا سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ آپ اس مایۂ ناز تصنیف سے فائدہ کس طرح اٹھائیں گے؟ میرے نزدیک پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے کہ بزمیں لغت کا مطالعہ التزاماً شروع کریں۔ اس طرح کہ قرآن کریم کی کوئی آیت تلاوت کی جائے اور اس کے اہم الفاظ کی تشریح لغت میں سے پڑھ کر سنائی جائے، اور افہام و تفہیم کا سلسلہ اختیار کیا جائے۔ نیز بزموں کے اجلاس کے علاوہ قرآنی مطالعہ کے مراکز بھی قائم کئے جائیں، جہاں قرآنی تصورات کی وضاحت کا انتظام لغت کے ذریعہ ہو۔

آپ لغت کی اشاعت کے لئے بیتاب تھے۔ اتنے بیتاب کہ آپ کی جیبوں کے منہ خود بخود کھل گئے، اور اس کی طباعت کے لئے معقول رقم فراہم ہوگئی۔ ایسی بیتابی کے خاتمہ پر عملی اقدام ضرور ہونا چاہیئے۔ عملی اقدام آپ کے لئے اہم فریضہ ہے اور اس فریضہ کی ادائیگی سے ہی آپ قرآنی معاشرہ کی تشکیل کر سکتے ہیں۔

گذشتہ کنونشن میں بتایا گیا تھا کہ لغات اور مفہوم القرآن کی طباعت کے لئے پیشکش کی مجموعی رقم سوا بیالیس ہزار سے قدرے زیادہ تھی۔ اور یہ کہ لغت کی پہلی جلد کی تکمیل تک کے اخراجات تینتیس ہزار کے قریب ہو جائیں گے۔ اسی

لغات فنڈ

کنونشن میں آپ نے طے کیا تھا کہ لغات فنڈ، جو لغات القرآن اور مفہوم القرآن دونوں کی طباعت کے لئے جمع ہوا تھا، وہ مزید تصانیف کی طباعت پر خرچ کیا جائے اور ان کی فروخت سے جب پوری رقم واپس مل جائے تو اس کا آخری فیصلہ کنونشن ہی میں کیا جائے۔ ابتدا سے لغات فنڈ ادارہ کی تحویل میں تھا اور جملہ اخراجات اس کے صحیح مصرف میں کئے جاتے رہے ہیں۔ لغت کی بہ عجلت تیاری کے دوران میں کتاب کی فروخت کی رفتار سست اور روپیہ کی واپسی توقع سے بہت کم ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے طباعت کے کثیر اخراجات کے لئے دیگر انتظامات ضروری ہوگئے۔ چنانچہ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کی تشکیل کی گئی، اور پرویز صاحب کی تصنیفات کی طباعت اور فروخت کی ذمہ داری اس کے سپرد ہوگئی ہے۔ اسی سلسلہ میں لغت کا سٹاک بھی مذکورہ فرم کو منتقل کر دیا گیا ہے۔ لیکن جہاں تک لغات فنڈ کی رقم کا تعلق ہے، اس کی حفاظت اور بالآخر کنونشن کو واپسی کی جملہ ذمہ داری کلیتہً ادارہ کے سر پر علیٰ حالہٖ قائم رہے گی۔ میزان پبلیکیشنز کی رپورٹ علیحدہ پیش ہوگی۔

ختم ہونے والے سال میں ادارہ کی اہم ترین مصروفیت، آنے والے آئینِ پاکستان کو قرآنی اصولوں پر منتشکل کرانے کی مہم تھی۔ اس مہم کو سر کرنے کے لئے پہلے پرویز صاحب نے طلوع اسلام میں ذاتی اپیل کی، جس پر تقریباً چالیس احباب نے

آئینِ پاکستان

لبیک کہا، اور پیش کردہ رقم دو سال تک ادا کرتے رہنے کا وعدہ فرمایا۔ یہ دو سال اگست ۱۹۶۱ء میں پورے ہوں گے۔ لیکن معطیان کی تعداد برابر گھٹتی گئی، اور مارچ ۱۹۶۱ء میں صرف پانچ رہ گئی ہے!

آئین کی مہم کے لئے گذشتہ کنونشن میں سینٹرل پبلسٹی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تھا۔ کمیٹی کے لئے آپ نے دونوں ہاتھ بھر کر امداد فرمائی۔ ترازو کے ایک پلڑے میں آپ کے عطیات تھے اور دوسرے میں محترم حاجی خیر محمد پراچہ صاحب کا ہموزن

عطیہ۔ فراہم شدہ رقم سے کمیٹی نے پورا پورا فائدہ اٹھایا، اور آئینی کمیشن کے جاری کردہ سوالنامے کے جوابات بھیجنے کی آخری تاریخ تک زور شور سے کام کرنے کے بعد اپنی کارکردگی کو ختم کر دیا۔ اور حیدرآباد سب کنونشن کے فیصلے کے مطابق جتنی رقم کمیٹی کی تحویل میں تھی، وہ تازہ تشکیل شدہ مجلسِ عاملہ کے سپرد کر دی۔ اب یہ مجلسِ عاملہ قرآنی لٹریچر کی نشر و اشاعت کے لئے ذمہ دار ہے۔

آئینی کمیشن کی رپورٹ زیرِ ترتیب ہے، اور اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ ماہِ رواں کے آخر تک رپورٹ صدرِ مملکت کی خدمت میں پیش ہو جائے گی۔ قرائن اچھے اور باعثِ اطمینان ہیں، کیونکہ بڑی حد تک فضا قرآن کے حق میں بدل چکی ہے۔ صدرِ مملکت کا پیغام جو ۲۲ اکتوبر کو نشر ہوا، موصوف کی وہ تقاریر جو سعودی عرب، مصر و شام، انڈونیشیا، جاپان وغیرہ میں ہوئیں، عائلی کمیشن کا قانون، رویتِ ہلال کا قضیہ، سب کا رُخ ایک ہی سمت ہے۔ یعنی یہ سمتِ کعبہ اور وہ سمت ہے قرآن کے غیر متبدل اصولوں، اور اس کے عطا کردہ مستقل اقدار کی۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

ادارہ کے روز افزوں خسارہ کے پیشِ نظر پہلے مکتبہ طلوعِ اسلام کا قیام عمل میں آیا جو پرویز صاحب کی تصنیفات کے علاوہ دیگر کتب بھی مہیا کرتا تھا۔ پھر میزان پبلیکیشنز لیمیٹڈ کی تشکیل ہوئی جو اب ادارہ کے بیشتر کاروبار کی ذمہ دار ہے

مالیات

ادارہ میں جو کام باقی رہ گیا ہے، وہ صرف ماہنامہ طلوعِ اسلام سے متعلق ہے اور بس۔ نتیجتاً ادارہ کے عملے میں بھی ضروری تبدیلی کر دی گئی ہے۔

سابقہ رپورٹ میں ادارہ کی مالیات کے ضمن میں کہا گیا تھا کہ ادارہ اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کی کوشش کرتا ہے، اور بیرونی امداد سے مستغنی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ادارہ نے ہفتہ وار طلوعِ اسلام کے اجراء، لغت کی طباعت اور آئینِ پاکستان کے سلسلے میں باہر سے روپیہ حاصل کیا، اور یہ کہ اصولی ہدایات برائے نظم و ضبط بزمہائے طلوعِ اسلام کے تحت بزموں کی آمدنی کا کچھ حصہ ادارہ کو منتقل ہوتا ہے۔ لیکن تاحال کسی بزم نے ایک پائی بھی ادارہ کو منتقل نہیں کی، اور اگر منتقل کرتی بھی تو اصولی ہدایات کے مطابق وہ صرف بزموں پر خرچ ہوتی، اور ادارہ کے کسی استعمال میں ہرگز نہیں آ سکتی تھی۔ دیگر اپیلیں خاص خاص مقاصد کے لئے تھیں اور موصولہ رقوم انہی مقاصد پر صرف ہوئیں۔ ان رقوم میں سے ایک پیسہ بھی ادارہ کے اپنے اخراجات میں خرچ نہیں ہوا۔ لغات فنڈ کی حیثیت بالکل مختلف ہے۔ اس کی حیثیت امانت کی ہے، جو فی الحال تو استعمال میں آ رہی ہے، لیکن جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، وہ بالآخر انہی اصحاب کو لوٹا دی جائے گی۔ لغات فنڈ کے خرچ ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مطبوعات

لغات القرآن کی تین جلدوں کے علاوہ تاریخ الامت کا پہلا حصہ دوبارہ شائع ہوا، اور اس کا دوسرا اور تیسرا حصہ زیرِ طبع ہیں۔ نیز پانچ کتابچے بھی شائع ہوئے، جن کے عنوانات ہیں۔ کتابِ سنت، ضبطِ ولادت، پاکستان کی کہانی، وحدتِ ملت اور اسلامی قانون کی اصل و بنیاد۔ ان کتابچوں میں سے ایک (ضبطِ

ولادت) انگریزی میں بھی چھپا ہے۔

دورے

سالِ زیرِ رپورٹ میں، پرویز صاحب نے ایک بار سیالکوٹ، حیدرآباد اور راولپنڈی، اور دو بار کراچی کا دورہ فرمایا۔ دوروں کی تفصیل طلوعِ اسلام میں شائع ہو چکی ہے۔ حیدرآباد کا سفر سب کنونشن کے سلسلہ میں تھا۔

درس

پرویز صاحب کا ہفتہ وار درس باقاعدگی سے جاری رہا۔ درس اب سورۂ فاتحہ سے مسلسل ہو رہا ہے۔ اب تک سورۂ بقرۃ کی نوے آیات ہو چکی ہیں۔ حسبِ سابق درس ٹیپ پر محفوظ کیا جاتا ہے تاکہ دیگر مقامات پر بھی بزموں کے ذریعے سنایا جا سکے۔

بزمیں

گذشتہ سال اندرون اور بیرون پاکستان میں متعدد بزمیں قائم ہوئیں۔ اندرونِ پاکستان ڈیرہ اسماعیل خان، سرگودھا، بورے والا (ضلع ملتان) لیہ (ضلع مظفرگڑھ) چک جھمرہ (ضلع لائل پور) اور موجیانوالہ (ضلع گجرات) میں۔ بیرونِ پاکستان کویت، لندن اور برمنگھم میں۔ نئی بزموں کے قیام کے علاوہ چار مقامات پر سابقہ بزموں کی تجدید ہوئی۔ یعنی کوئٹہ، لائل پور، مظفرگڑھ اور جلال پور جٹاں (ضلع گجرات)۔ سرگودھے میں بزمِ خواتین بھی قائم ہوئی۔

سرگودھے میں قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں محترم فیاض علی خاں صاحب نمائندۂ بزم، محترمہ مسعودہ رحیم صاحبہ نمائندۂ بزمِ خواتین اور محترم چودھری نصر اللہ خاں صاحب ترجمان کی مساعی بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہیں۔

انگلستان میں بزموں کے قیام کی داستان یوں ہے کہ اگست ۱۹۶۰ء میں محترم میاں عبدالخالق صاحب نمائندۂ بزم کراچی یورپ کے دورے پر روانہ ہوئے۔ دورے کا مقصد کاروباری تھا لیکن میاں صاحب ساتھ ساتھ قرآنی پیغام کے سفیر کی خدمات بھی انجام دیتے رہے۔ چنانچہ موصوف کی مساعی سے ۲۰ر نومبر ۱۹۶۰ء کو لندن میں، اور ۲۵ر فروری ۱۹۶۱ء کو برمنگھم میں بزمیں قائم ہو چکی ہیں۔ میاں صاحب کی جدوجہد کا آئندہ مرکز گلاسگو بننے والا ہے۔ **اللّٰھم زد فزد۔**

عائلی کمیشن

گذشتہ کنونشن میں عائلی کمیشن کی سفارشات کو عملی شکل دینے کے لئے قرارداد منظور ہوئی تھی۔ الحمد للہ کہ ۳ر مارچ ۱۹۶۱ء کو صدرِ پاکستان نے کمیشن کی بعض سفارشات کو قانونی حیثیت دینے کا آرڈیننس جاری فرما دیا ہے، جن میں یتیم پوتے اور نواسے وغیرہ کا حقِ وراثت بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ اس آرڈیننس نے پاکستان میں مسلم عورتوں کو وہ حقوق دینے کی ابتدا کر دی ہے، جو انہیں قرآنِ کریم نے عطا فرمائے ہیں۔ صدرِ مملکت کا یہ اقدام اسلام کی تاریخ میں انقلابِ عظیم کا پیش خیمہ ہے۔ صنفِ نازک نے، جو صدیوں سے مظلوم اور معطل چلی آ رہی تھی، آرڈیننس کا گرمجوشی سے خیر مقدم کیا ہے۔ اور اب توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مزید قرآنی حقوق حاصل کرنے اور پاکستان کے استحکام اور ترقی میں پوری ہمت سے حصہ لینے کی کوشش کرے گی۔ کنونشن کے لئے نہایت مناسب ہو گا کہ وہ آرڈیننس کے نفاذ پر صدرِ مملکت کی خدمت میں شکریے کی قرارداد پیش کرے۔

کمیشن کی رپورٹ سے ظاہر ہے کہ اس کے سوالنامے کے جواب میں ادارہ نے جو تجاویز کی تھیں۔ وہ کمیشن کی خاص

تعلیمی کمیشن توجہ کا مرکز بنی ہیں۔ تعلیم کا مسئلہ پاکستان کے لئے بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور آئین کے بعد اس کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ استحکامِ پاکستان کے لئے یہ امر لابدی ہے کہ آئندہ نسل کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر کی جائے۔ کیریکٹر کے موجودہ فقدان کا واحد علاج موجودہ اور آئندہ نسل کی صحیح تعلیم ہے۔ ایسی تعلیم، جو قرآن کے غیر متبدل اصولوں اور اس کے عطا فرمودہ مستقل اقدار کی آئینہ دار ہو۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہوگا کہ زیرِ ترتیب نیا نصاب پورے طور پر قرآنِ کریم پر مبنی ہو۔ وقت کا تقاضا ہے کہ نصاب کمیٹی کو اس بنیادی معاملہ کی طرف خاص طور پر متوجہ کیا جائے۔

گذشتہ کنونشن میں تعلیمی ضروریات کو خاص توجہ دی گئی تھی۔ اور محترم چوہدری افتخار احمد صاحب کے مقالہ کی بنا پر موصوف کی صدارت میں تعلیمی کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ افسوس ہے کہ تعلیمی کمیٹی نے اپنے فریضہ پر توجہ نہیں کی اور اس اہم موضوع پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ حالات مقتضی ہیں کہ تعلیم اور نصابِ تعلیم پر بعجلت تمام توجہ دی جائے۔

مین پاور کمیشن کمیشن کے جاری کردہ سوالنامہ کے جوابات ادارہ نے قرآنی نقطۂ نظر سے دیدیئے ہیں۔ توقع ہے کہ کمیشن ان جوابات پر پورا غور کرے گا اور معاشرہ کو قرآنی خطوط پر تشکل کرنے کی حتی الامکان کوشش میں دریغ نہیں کیا جائے گا۔

آخری گذارش مفہوم القرآن کا نمونہ پیش کیا جا چکا ہے، اس کی طباعت اب مسلسل شروع ہوگی۔ قرآن کریم کے مطالب سمجھانے کا یہ نیا اور سہل انداز ہے۔ اردو داں طبقہ کے لئے جو عربی سے واقف نہیں، مفہوم القرآن انشاء اللہ بڑی نعمت ثابت ہوگا۔ لغات القرآن کا تتمہ ہونے کی جہت سے مفہوم القرآن محترم پرویز صاحب کے قرآنی مطالعہ کا آخری ثمرہ، ساری زندگی کا حاصل، اور سلسلۂ تصانیف میں موصوف کا شاہکار ہے۔ ایسے نایاب تحفے کی قدر لازم اور اس سے زیادہ سے زیادہ استفادہ نہایت مناسب بلکہ از حد ضروری ہے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کیلئے خود قرآن کریم ہی آخری، مکمل اور تیر بہدف ذریعہ ہے۔ اس لئے مفہوم القرآن کو زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں پہنچایئے اور اس کی اشاعت کو وظیفۂ زندگی بنا لیجئے۔

پرویز صاحب کا ارادہ ہے کہ مفہوم القرآن کو بیک وقت چھاپنے کی بجائے جزواً جزواً چھاپا جائے، اور جزو کی قیمت اتنی ہو کہ وہ کسی جیب پر بار نہ ہو، بلکہ آسانی سے ادا کی جا سکے۔ اس انتظام سے اشاعت میں آپ کو بہت سہولت ہوگی۔ لہٰذا انتہائی کوشش کیجئے کہ مفہوم القرآن ہر پڑھے لکھے گھر میں ضرور پہنچ جائے، اور اس کوشش میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو۔

رپورٹ

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

(جسے چوہدری عبدالرحمٰن صاحب مینجنگ ڈائرکٹر نے طلوعِ اسلام کنونشن میں پیش کیا)

برادرانِ عزیز!

جیسا کہ میں نے کل اپنی استقبالیہ رپورٹ میں وعدہ کیا تھا۔ میں اس وقت آپ کے سامنے میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کے تعارف کی غرض سے حاضر ہوا ہوں۔

جیسا کہ ہمارے رفیقِ بزرگ و محترم، مولانا عبدالرب صاحب نے اپنی رپورٹ میں بالوضاحت بیان فرمایا تھا، ادارۂ طلوعِ اسلام کے نظم و نسق اور اخراجات کی پوری ذمہ داری محترم پرویز صاحب نے تنہا اپنے سر لے رکھی ہے۔ اس کی آمدنی کا واحد ذریعہ پرویز صاحب کی کتابیں ہیں، جنھیں وہ خود ہی لکھتے اور خود ہی چھپواتے تھے۔ اپنی کتابوں کی بچت سے رسالہ طلوعِ اسلام کا خسارہ پورا کرتے۔ اور قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے اخراجات برداشت کرتے تھے۔ جُوں جُوں یہ کام بڑھتا گیا، کتابوں کی طباعت و اشاعت و فروخت کا کام بھی زیادہ ہوتا گیا۔ اور اس کے ساتھ اخراجات بھی بڑھتے چلے گئے۔ معمول کے مطابق بھی یہ چیزیں کچھ کم توجہ طلب اور پریشان کن نہ تھیں۔ لیکن سالِ گذشتہ جب لغات القرآن کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس سے ان کی مصروفیات اور پریشانیاں اس قدر بڑھ گئیں کہ جن احباب کو انہیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملتا تھا، انھوں نے شدت سے محسوس کیا کہ اگر صورتِ حالات کچھ عرصہ تک یہی رہی تو اس سے تحریک کو ایسا نقصان پہنچنے کا احتمال ہے جو شاید ناقابلِ تلافی ہو جائے۔ چنانچہ چند احباب مل بیٹھے، اور انھوں نے اس کی کوئی بہتر شکل پیدا کرنے کی تجاویز پر غور کیا۔ بالآخر طے پایا کہ جہاں تک ادارہ کی کتابوں کی طباعت۔ اشاعت اور فروخت کا تعلق ہے، اس کا انتظام ایک الگ جماعت کے سپرد کر دیا جائے۔ اور ان انتظامات کو مستحکم اور قانونی طور پر بامضابطہ شکل دینے کے لئے اس جماعت کو ایک لمیٹڈ کمپنی کی صورت میں متشکل کر دیا جائے۔ چنانچہ اس طرح 'میزان پبلیکیشنز' کے نام سے یہ لمیٹڈ کمپنی قائم کر دی گئی جسے رجسٹرار سے باقاعدہ منظور کرا لیا گیا ہے۔

محترم پرویز صاحب نے اپنی کتابوں کا سارا اسٹاک، جو اُن کے پاس مطبوعہ شکل میں موجود تھا، قریب قریب لاگت پر اس کمپنی کے حوالے کر دیا اور اس کے عوض کچھ بھی نقد وصول نہیں کیا۔ کمپنی کے پاس اتنا سرمایہ تھا ہی نہیں جو انہیں نقد دے سکتی۔ انہیں کچھ تو کمپنی کے حصص دیئے گئے، اور بقایا رقم کمپنی کے ذمہ ان کا قرض تسلیم کر لیا گیا۔ اس وقت تک جن احباب نے اس کمپنی کے حصص خریدے ہیں، اُن کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں۔

(۱)۔ محترم بی۔ اے پرویز (۲)۔ محترم اے۔ رحمٰن چوہدری (۳)۔ محترم حاجی خیر محمد پراچہ (۴)۔ محترم شیخ محمد شفیع (۵)۔ محترم حافظ برکت اللہ (۶) محترم ملک عبدالوحید (۷) محترم راجہ محمد اکرم (۸)۔ محترم گلزار ایم۔ چغتائی (۹)۔ محترم محمد صادق (۱۰)۔ محترم چوہدری لال خاں۔

اس ضمن میں اتنا واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ جس طرح سالِ گزشتہ محترم حاجی خیر محمد صاحب نے پبلسٹی کے فنڈ میں سب سے بڑھ کر حصہ لیا تھا، اسی طرح اس کمپنی کے قیام اور فروغ میں بھی وہ سب سے آگے ہیں۔ اس کے لئے ہم تمام احباب کی طرف سے محترم حاجی صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس میں شبہ نہیں کہ کمپنی کا کاروبار تجارتی خطوط پر ہوگا، لیکن چونکہ اس کا بنیادی مقصد ادارہ طلوعِ اسلام کے لٹریچر کی عام اشاعت ہے، اس لئے ضروری سمجھا گیا کہ جو احباب اس قرآنی فکر سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کے حصے خریدنے میں انہیں ترجیح دی جائے۔ اس مقصد کے لئے ہم نے طلوعِ اسلام کی تمام بزموں کو نجی طور پر چٹھی لکھ کر انہیں دعوت دی کہ وہ احباب کو حصے خریدنے کی دعوت دیں۔ مجھے افسوس ہے کہ (لندن اور مردان کی بزم کے سوا) کسی بزم کی طرف سے بھی ایسے احباب کے نام موصول نہیں ہوئے جو حصے خریدنے پر آمادہ ہوں۔

ادارہ کی کتابوں کی فروخت کے علاوہ، میزان لمیٹڈ دوسری بلند پایہ کتابوں کی اشاعت اور فروخت کا بھی انتظام کرے گی۔ اشاعت کے لئے کتابوں کا انتخاب ڈائرکٹران کی خاص کمیٹی کی رُو سے عمل میں آئے گا۔ اس کے علاوہ یہ کمپنی پرنٹنگ یعنی چھپائی کا کام بھی کرے گی۔ اس وقت کمپنی کا اپنا پریس ہے جس میں لغات القرآن کی آخری جلد چھپی ہے، اور جس میں اب مفہوم القرآن چھپے گا۔

اس انتظام سے محترم پرویز صاحب کے سر سے وہ بوجھ اُتر گیا جس نے انہیں قبل از وقت بوڑھا کر دیا تھا۔ اور جس سے تحریک کو کافی نقصان پہنچ رہا تھا۔ جس عظیم مفکر نے اپنی زندگی قرآنی فکر کے لئے وقف کر دی ہو۔ اُس کا وقت اور توانائی کا اس قسم کے کاموں میں صرف ہونا اس فکری تحریک کے لئے سخت نقصان نہیں تو اور کیا ہے۔ ؟ لیکن جدید انتظامات اسی صورت میں کامیاب ہو سکتے ہیں کہ آپ احباب جو اس فکر کی عام نشر و اشاعت چاہتے ہیں، اس کمپنی کے حصے داروں میں شریک ہوں۔ یاد رکھئے! اگر یہ انتظام مضبوط بنیادوں پر قائم نہ ہوا تو اس سے تحریک کو اس قدر نقصان پہنچے گا جس کا ہم تصور نہیں کر سکتے۔ میں یہ کہنا بھول گیا کہ میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کے چیئرمین خود پرویز

صاحب ہیں۔ اور مجھے اس کا مینیجنگ ڈائرکٹر مقرر کیا گیا ہے۔ سردست اس کے ڈائرکٹر حسبِ ذیل احباب ہیں۔
جناب پرویز صاحب ۔ حاجی خیر محمد پراچہ صاحب ۔ میاں محمد شفیع صاحب ۔ میاں عبدالخالق صاحب
عبدالرحمٰن صاحب ۔ راجہ محمد اکرم صاحب ایڈوکیٹ ۔

کمپنی کے قواعد و ضوابط مطبوعہ شکل میں موجود ہیں اور میزان کے بک اسٹال سے جو پنڈال کے سامنے ہے انہیں دیکھا جا سکتا ہے۔

جیسا کہ ہر تعمیری پروگرام کے ساتھ ہوتا ہے۔ میزان لمیٹڈ کے متعلق بھی تخریبی عناصر طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کر رہے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ تحریک چند سرمایہ داروں کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ کہیں کہا جاتا ہے کہ ادارہ اب کاروباری بن گیا ہے اور اس نے تجارت شروع کر دی ہے۔ کہیں یہ پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے کہ طلوعِ اسلام کی بزمیں اس کاروباری کمپنی کی بلا کمیشن ایجنٹ ہوں گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان میں سے ہر بات فتنہ پردازی پر مبنی ہے۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، کمپنی کے حصّے خریدنے کی دعوت تمام بزموں کو دی گئی، اور یہ دعوت اب بھی کھلی ہے۔ جو صاحب حصّے خریدنا چاہیں وہ شوق سے آگے آئیں۔ باقی رہا اسے کاروباری بن جانا۔ تو جہاں تک کتابوں کی اشاعت اور فروخت کا تعلق ہے۔ ادارہ شروع سے کاروباری تھا۔ وہ کتابیں چھاپتا تھا اور انہیں فروخت کرتا تھا۔ اب یہی کام ایک مشترکہ کمپنی کرے گی۔ اور یہ یقیناً پہلے سے بہتر انتظام ہے۔ اس ضمن میں اتنا عرض کر دینا غیر محل نہ ہوگا کہ جیسا کہ محترم مولانا عبدالرب صاحب نے اپنی رپورٹ میں فرمایا ہے، ادارہ کی تمام کتابوں کی اشاعت وغیرہ کے سلسلہ میں پرویز صاحب نے اپنوں یا بیگانوں میں سے کسی سے کوئی مدد نہیں لی۔ احباب نے اس باب میں جب کبھی حصّہ لیا تو وہ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے لئے تھا۔ کتابوں کی اشاعت میں ان کا ایک پیسہ بھی صرف نہیں کیا گیا۔ لغات القرآن کی طباعت کے سلسلہ میں کنونشن نے جو کچھ جمع کیا تھا، اُسے پرویز صاحب نے بطورِ قرض قبول کیا تھا۔ اور اب وہ قرضہ کتابوں کی شکل میں واپس کر دیا گیا۔ لہٰذا ادارہ کی تمام کتابیں محترم پرویز صاحب کی ملکیت ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ان کے منافع کو تحریک کے مقاصد کے لئے صرف کرتے رہے ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جب حالات یہ ہوں تو ہم میں سے کسی کو اس کا حق کیسے پہنچتا ہے کہ ہم اعتراض کریں کہ ان کتابوں کی فروخت یا اشاعت کا فلاں قسم کا انتظام کیوں کیا جائے۔ پرویز صاحب جس طرح مناسب سمجھیں اپنی کتابوں کا انتظام کریں۔

باقی رہا رسالہ طلوعِ اسلام کے خسارے یا نشر و اشاعت کے دیگر اخراجات کا تعلق۔ سو اس کی ذمہ داری پہلے بھی محترم پرویز صاحب کے سر تھی، اور اب بھی اس کے وہی ذمہ دار ہیں۔ وہ اسے کس طرح پورا کرتے ہیں؟ اس کے لئے نہ کبھی انہوں نے آپ سے سوال کیا نہ آپ نے اُن سے پوچھا، نہ ہی وہ اب کسی سے کچھ مانگتے ہیں۔ جہاں تک بزموں کے ذریعہ کتابوں کی فروخت کا تعلق ہے، سو پہلے بھی جن بزموں نے باقاعدہ فروخت کا کام کیا، انہیں ان پر کمیشن ملتا رہا۔ اب بھی جو ایسا

کریں گی انہیں دیگر کتب فروشوں کی طرح کمیشن دیا جائے گا۔ باقی رہا یہ کہ بزموں کے اراکین یا قرآنی فکر سے دلچسپی رکھنے والے دیگر حضرات ان کتابوں کا چرچا کرتے ہیں اس طرح ان کی فروخت میں مدد دیتے ہیں۔ تو جو احباب سمجھتے ہیں کہ یہ کتابیں ایسی ہیں جنہیں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو پڑھنا چاہیئے، تو وہ ان کا چرچا ضرور کریں گے۔ اور مخالفین ان کی مخالفت کریں گے۔ لیکن اگر کوئی سمجھتا ہے کہ میں ان کا چرچا کرنے سے میزان لمیٹڈ کا بلا کمیشن ایجنٹ ہوں تو وہ ان کا چرچا نہ کرے۔

میرا خیال ہے کہ میں نے پوزیشن واضح کر دی ہے۔ لیکن اگر کوئی مزید کستر وضاحت طلب ہو تو آپ احباب اس کے متعلق مجھ سے دریافت کر سکتے ہیں۔ میں اس کے لئے حاضر ہوں۔ والسّلام۔

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ کی

تازہ ترین پیشکش

اسلام پر کیا بیتی؟

یعنی علامہ احمد امین مصری کی معرکہ آرا کتاب

ضحی الاسلام

جزو اوّل کا شگفتہ اور سلیس ترجمہ

- تاریخ کا شاہکار۔
- اسلام پر ایرانی تمدن کے اثرات کا مرقع۔
- اسلام کیا تھا اور کیا بن گیا؟
- ایسا کیوں ہوا؟
- کس طرح ہوا؟

ان تمام سوالات کے محققانہ جوابات۔ قریب چار سو صفحات۔ لیتھو کی عمدہ چھپائی۔ مجلّد۔ قیمت صرف چار روپے

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷۔ بی شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

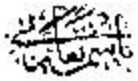

باسمہ تعالیٰ

مژدۂ صبح

دریں تیرہ شبانم دادند
شمع کشتند و زخورشید نشانم دادند

محترم پرویز صاحب کا استقبالیہ

جس سے انھوں نے طلوعِ اسلام کنونشن (۱۹۶۱ء) سے خطاب کیا

شائع کردہ

ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بادہ نوشانِ

خمکدۂ حجاز

کے نام

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

یارانِ میکدہ! سلام و رحمت

ماہِ رمضان، جشنِ نزولِ قرآن کی طرب انگیزیوں کی نوید جانفزا لیکر آتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی پیمانہ بردارانِ محمستانِ فرقانی کی آمد آمد کا خیال دامنِ نگاہ کو صحنِ صد گلستان و کفِ ہزار گلفروش بنا دیتا ہے۔ آپ احباب سے ملاقات کی آرزو میں سمٹ کر کاشانۂ چشم میں مرکوز ہو جاتی ہیں، اور ہر آن یہ محسوس ہوتا ہے کہ۔

پھر نظر میں پھول مہکے دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

اس تصور سے آپ کی یاد، اُفقِ قلب سے اُبھرتی چلی آتی ہے، اور میں ہمہ تن آغوش آپ کے استقبال کے لئے دیدہ و دل فرشِ راہ کئے، ہجومِ کیف و مستی میں یہ پیغامِ نہنیت بار آپ تک پہنچاتا ہوں کہ۔

چمن گلشن ما صورت بہار ہیا
کشاد دیدۂ گل بہر انتظار ہیا

آپ کنونشن میں شرکت کے لئے سامان سفر تازہ کرنے لگتے ہیں تو یہاں۔

ایک اک کرکے ہوئے جاتے ہیں روشن تارے
میری منزل کی طرف اُن کے قدم آتے ہیں

اور جہانِ شوق کا ایک ایک ذرہ پکار اٹھتا ہے کہ۔

رقص سے تیز کرو ساز کی لے تیز کرو
سوئے میخانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں

اور جب آپ مل جاتے ہیں تو میری داستانِ حیات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ خدا آپ کو خوش وخرم رکھے اور جن مقدس آرزوؤں اور حسین تمناؤں کو لے کر آپ یہاں جمع ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ سرسبز وشاداب رہیں، اور بارآور وثمربار ہوں۔

عزیزانِ من!

پاکستان میں عسکری انقلاب اکتوبر ۱۹۵۸ء میں آیا تھا۔ اس کے بعد جب ہم اپریل ۱۹۵۹ء کی کنونشن میں اسی مقام پر جمع ہوئے تو

عسکری انقلاب کا استقبال

میں نے اپنے خطاب میں، جس کا عنوان "پیامِ فصلِ بہار" تھا، کہا تھا۔

"سطح بین نگاہوں کے نزدیک یہ انقلاب شاید بساطِ سیاست کی مہرہ بازیوں کا نتیجہ ہو، لیکن جن کی نظریں سطح سے نیچے اُتر کر گہرائی تک پہنچتی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اس کے پیچھے کائناتی قوتوں کا ہاتھ کارفرما تھا۔ یہی وہ قوتیں ہیں جنہیں عام الفاظ میں زمانے کے تقاضے کہا جاتا ہے۔

زمانے کے تقاضے پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ۔

پرانی سیاست گری خوار ہے ٭ زمیں میر وسلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا ٭ تماشا دکھا کر مداری گیا

باقی دنیا تو زمانے کی اس پکار کو دل کے کانوں سے سن رہی تھی، لیکن ہماری حالت یہ تھی کہ ہم اپنے کانوں پر غفلت کے لحاف لپیٹ کر سوئے رہنا چاہتے تھے۔ اگر کچھ وقت تک اور ہمارا یہی حال رہتا، تو کم از کم مجھے تو صاف نظر آرہا تھا کہ اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے کمیونزم کا سیلاب اپنی تلاطم خیزیوں کے ساتھ اُمنڈ کر آجائے گا۔ اور ہمارے تمام نظریاتِ زندگی اور تصوراتِ حیات کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جائیگا۔ غنیمت ہے کہ اس طوفانِ بلاانگیز کی آمد سے پہلے ہم نے خود اپنے ہاتھوں سے ایسی تبدیلی پیدا کرلی جس سے سرمایہ داری کی پروردہ سیاست کی بساط الٹ گئی۔ اس انقلاب کا پہلا مظاہرہ زرعی اصلاحات کی شکل میں

سامنے آیا ہے تو :

علامہ اقبالؒ نے زمینداری کو ان لعنتوں میں شمار کیا تھا جو جسدِ انسانیت پر کابوس بنکر مسلط ہیں۔ اُن کے الفاظ ہیں۔

سرگذشتِ آدم اندر شرق و غرب
بہرِ خاکے فتنہ ہائے حرب و ضرب

اور زمیندار سے کہا تھا کہ۔

دِہ خدایا! نکتہ از من پذیر
رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

اس لئے کہ ۔۔

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت
ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

عسکری انقلاب کے تیشے کی پہلی ضرب اسی آکاش بیل پر پڑی جو شجرِ انسانیت کو بُری طرح خشک کئے جا رہی تھی۔ اگرچہ اس کی ابھی تک جڑ نہیں کٹی۔ لیکن اس کی شاخ تراشی بڑی حد تک ہوگئی ہے۔

تین اور بلائیں

اقبالؒ نے زمینداری کے بعد تین اور بلاؤں کا ذکر کیا ہے جو وجہ مرگِ انسانیت ہیں۔ وہ مسلمان سے خطاب کر کے کہتے ہیں۔

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری

زرعی اصلاحات کے بعد عسکری حکومت نے اوقاف کو اپنی تحویل میں لیکر "پیری" کی "مقدس گرفت" کو جو دورِ حاضر میں انسانیت کو اپنے شکنجوں میں کسے رکھتی ہے، بڑی حد تک ڈھیلا کر دیا، اور خلقِ خدا کو قدرے آسانی سے سانس آنے لگا۔ جہاں تک "سلطانی" کا تعلق ہے، دیگر ممالک میں عسکری انقلاب کا نتیجہ آہنی ڈکٹیٹرشپ کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہی خطرہ یہاں بھی تھا، لیکن حکومت نے جمہوری طرزِ حکومت کے اعلانات اور آئینی کمیشن کے تقرر سے اس خطرہ کے امکانات کا ازالہ کر دیا۔ اب رہی "ملائیت" سو اس کی گرہیں اس قدر مضبوط چلی آ رہی ہیں کہ انہیں کھولنے کے لئے تیز ترین ناخنِ تدبیر کی ضرورت تھی۔

چودہ سو سال کا عرصہ ہوا جب حضور خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وسلم) نے قرآنی قوانین کو دنیا میں نافذ فرمایا۔ اس سے انسانیت

ملائیت کا شکنجہ

کو کس قدر سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہوئیں، اس پر اس دورِ ہمایونی کی صحیح تاریخ کے درخشندہ اوراق شاہد ہیں۔ یہ سلسلہ حضورؐ کے بعد بھی کچھ عرصہ تک قائم رہا لیکن اس کے بعد (ہماری بدبختی کہ) یہ گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی، اور خدا کے قوانین کی جگہ پھر انسانوں کے خود ساختہ قوانین نے لے لی۔ دیکھیں

طرح سے ہوا، اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ آپ احباب کو علم ہے کہ دسے میں نے اپنے مقالہ "اسلام آگے کیوں نہ چلا" میں شرح و بسط سے بیان کیا تھا (جو اب "سلیم کے نام خطوط" میں شائع ہو چکا ہے)۔ اس غیر خدائی قانون کے اشہب عنان تاب کی باگیں ملوکیت اور ملائیت کے ہاتھ میں تھیں۔ ملوکیت نے مُلکی قوانین سنبھال لیے۔ اور شخصی قوانین، مذہبی پیشوائیت کے سپرد کر دیئے گئے۔ یوں "براہمن اور کھشتری" کی پرانی گٹھ جوڑ اس اُمت کے اندر بھی نمودار ہو گئی جو اس ثنویت کو مٹانے کے لئے پیدا کی گئی تھی۔ یہ دونوں زمامِ اختیارات ہاتھ میں لئے، ہوا کے گھوڑوں پر سوار تھے، اور مظلوم و مقہور انسانیت "جگن ناتھ جی" کے اس رتھ کے آہنی پہیوں کے نیچے کچلی چلی جا رہی تھی۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے خاتمہ پر انگریزی حکومت آئی تو اس میں بھی یہی ثنویت قائم رہی ——— اس میں انگریزی کی کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ ہر سیکولر حکومت میں یہ تفریق و تقسیم باقی رہتی ہے ——— جب تحریکِ پاکستان کی آواز بلند ہوئی تو (جیسا کہ طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں بتایا گیا ہے) ہمارے "علمائے کرام" کی طرف سے اس کی سخت مخالفت ہوئی۔

پاکستان کی مخالفت

اس کی وجہ بالکل عیاں تھی۔ ہندوؤں نے انہیں یقین دلا رکھا تھا کہ حکومت سیکولر انداز کی ہوگی جس میں شخصی قوانین، مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں رہیں گے۔ اس کے برعکس مطالبۂ پاکستان کی بنیاد ہی اس تصور پر تھی کہ اس خطۂ زمین میں صحیح اسلامی حکومت قائم کی جائے گی۔ اس حکومت میں مُلکی اور شخصی قوانین کی تفریق تو کجا، مذہبی پیشوائیت کی انسٹی ٹیوشن ہی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے مُلّا اسلامی حکومت کے مطالبہ کی تائید کس طرح کر سکتا تھا؟ ایسی حکومت کون چھوڑنا چاہتا ہے جس میں نہ پولیس کی ضرورت پڑے نہ فوج کی، اور گرفت میں رہیں لوگوں کے قلوب اور اذہان تک! لیکن فلکِ ناہنجار کی اس کجروی کا کیا علاج کہ ان کی سخت مخالفت کے علی الرغم، پاکستان وجود میں آگیا۔

عائلی کمیشن

۱۹۵۵ء میں عائلی کمیشن کا تقرر ہوا تو ملائیت کے چہرے کی رنگت اُڑنی شروع ہوئی۔ اسلئے کہ اس کمیشن کا دائرۂ تحقیق ان پرسنل لاز (شخصی قوانین) کو محیط تھا جن پر مُلّا کا قبضہ تھا۔ اور ہمارے معلوم تھا کہ اس سلسلہ میں جو اصلاحی قدم بھی اُٹھایا گیا وہ ان کے اختیارات کو ختم نہیں تو محدود ضرور کر دے گا۔ اس گروہ کا ایک نمائندہ کمیشن میں بطور رکن شامل تھا چنانچہ جب کمیشن کی سفارشات مرتب ہوئیں تو سب سے پہلے اس نمائندہ نے ان کے خلاف اختلافی نوٹ لکھا۔ یہ سفارشات اگرچہ قرآن کریم کی تعلیم کے کاملتہً مطابق نہیں تھیں، لیکن اُن کا رُخ اس کی سمت کو ضرور تھا۔ مُلّا کو بھلا یہ کب گوارا ہو سکتا تھا؟ مظلوم و مقہور بے زبان عورتوں کی زندگی جہنم میں گزرتی ہے تو گزرے۔ ہزاروں خاندان تباہ و برباد ہوتے ہیں تو ہوں۔ بیکس اور لاچار، معصوم اور یتیم بچے اپنے جائز حق سے محروم ہو کر در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں، تو کھایا کریں۔ اسلام غیروں کی نظروں میں اضحوکہ بنتا ہے تو بنا کرے۔ یہ سب کچھ علی الرغم قرآن کے خلاف ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ اس سے مذہبی پیشوائیت کو کیا واسطہ؟ اسے اپنی خدائی کو سنبھالنے اور برقرار رکھنے کی فکر ہوتی ہے۔ اور چونکہ ان (اصلاحی) سفارشات کی زد اس کی خدائی پر پڑتی تھی، اس لئے اس نے ان کے خلاف متحدہ محاذ کھڑا کر دیا، اور یہ سفارشات اس شور و غوغا میں گم ہو کر رہ گئیں۔ لیکن زمانے کے تقاضوں کو کب تک روکا جا سکتا تھا۔ عسکری حکومت نے ان تقاضوں کی اہمیت کا احساس کیا، اور نہایت جرأت و بسالت سے کام لیتے ہوئے

ان اصلاحات کی طرف پہلا قدم بڑھایا۔ ان اصلاحات کی مخالفت کرنے والوں کے متعلق محترم صدرِ پاکستان نے اپنے "پاکستان ٹائمز" کے پیغام میں کس قدر صحیح کہا ہے کہ:۔

"یہ اقدام نوعِ انسانی کے اس مظلوم طبقہ سے عدلِ عمرانی کی خاطر کیا گیا ہے جسے مذہب کے مسخ کردہ نقاب کی آڑ میں، اس کے بنیادی حقوق سے محروم کر دیا گیا تھا۔ جو لوگ اس سے مضطرب و بیقرار ہو رہے ہیں، انہیں چاہیئے کہ اپنے ضمیر کا جائزہ لیں، اور جو جذبات انہیں اس مخالفت پر آمادہ کر رہا ہے، اور جو خواہشات اس کے پیچھے کارفرما ہیں ان کا صحیح صحیح اندازہ کرنے کے لئے اپنے دلوں کو ٹٹولیں۔"

یہ ہے برادرانِ عزیز! اس شنویت کو ختم کرنے کی طرف پہلا قدم جو ہمارے دورِ مملوکیت میں پیدا ہوئی اور جس نے اُمتِ بیچارہ کو دوہرے استبداد کے شکنجوں میں کسے رکھا۔

۳ر مارچ کا نوروز

۳۔ مارچ کا دن میرے نزدیک اسلام کی تاریخ میں قابلِ یادگار "نوروز" ہے جب، قرنِ اول کے بعد پہلی مرتبہ ایک مملکت کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ عورتوں کو وہ حقوق دینا چاہتے ہیں جو انہیں قرآن کریم نے عطا کئے ہیں۔ برادرانِ گرامی قدر! کس قدر جواں بخت ہے ہمارا یہ دور جس میں چودہ سو سال کے بعد رجعت الی القرآن کی صدائے جمیل نے فضا میں حسین ارتعاش پیدا کیا ہے۔ کس قدر خوش نصیب ہے یہ خطۂ پاک جسے ان آسمانی قوانین کا گہوارہ بننے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ اور کس قدر مستحق تبریک و تہنیت ہے وہ ثریا بخت مملکت جس نے دنیا میں پھر سے قرآن کی آواز بلند کی ہے۔

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز
بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

اس سے آپ نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میں نے اس عسکری انقلاب کا اس قدر پُرجوش خیر مقدم کیوں کیا تھا، اور اس کے

تائید و مخالفت کا معیار

اصلاحی اقدامات کو درخورِ تبریک کیوں قرار دیا ہے۔ یاد رکھئے! کسی سے ہماری مخالفت اور موافقت کا جذبہ محرکہ ایک اور صرف ایک ہے۔ قرآن کی موافقت میں جب اور جہاں سے بھی آواز اٹھیگی، اُسے ہماری تائید و تعریف حاصل ہوگی۔ اس کے خلاف جو کچھ ہوگا ہم اسکی مخالفت کریں گے۔ ہماری وہ موافقت کسی ذاتی میلان و رجحان کا نتیجہ ہوگی، اور نہ یہ مخالفت کسی شخصی عناد و انتقام کی بنا پر۔ اور اس کی وجہ ظاہر اور بیّن ہے۔ ہمارے سامنے نہ کسی ذاتی مفاد کا خیال ہے، نہ سیاسی اقتدار کا تصور۔ ہم نہ کوئی پارٹی بنانا چاہتے ہیں، نہ مذہبی گروہ بندی۔ ہم نے آج تک (اپنے ہمنوا احباب کے علاوہ) نہ کسی گوشہ سے کوئی مالی امداد لی ہے، اور نہ کسی قسم کی کوئی رعایت حاصل کی ہے اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ خدا کے پیغام کے عام کرنے کے لئے اوّلین شرط یہ ہے کہ اس آواز کا بلند کرنے والا ساری دنیا سے علی الاعلان کہدے کہ۔ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۔ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۲۶:۱۰۹) "میں اس کے بدلے میں تم سے کوئی اجر نہیں مانگتا میرا اجر خدائے رب العالمین کے ذمے ہے۔" یہی ہے وہ پیغامِ رسالت

جو دنیا کے بلند سے بلند تر آستاں سے مستانہ وار بے نیاز گزر جاتا ہے، اور خدا کی چوکھٹ کے علاوہ کسی اور چوکھٹ کے سامنے اپنا سر نہیں جھکاتا۔ اللہ ہمیں اس ایمان عالیشان پر قائم رکھے۔

خواجۂ من! نگاہ دار آبروئے گدائے خویش
آنکہ ز جوئے دیگراں پُر نکند پیالہ را

ہماری کوششیں

عزیزانِ من! بیس سال سے زائد کا عرصہ ہوا جب میں نے قرآنی نظام کی تشکیل اور قوانینِ خداوندی کے احیاء کی آواز بلند کی۔ اس وقت میری یہ آواز بالکل تنہا آواز تھی۔ میں نے معاشرہ کے کمزور ترین طبقہ یعنی مسلم خواتین کی مظلومی پر نوحے کئے، اور ان کے قرآنی حقوق کی بازیابی کے لئے مسلسل و پیہم کوشاں رہا۔ میں نے یتیم پوتوں کی محرومی پر خون کے آنسو بہائے، اور انہیں اُن کے جائز حقوق دلوانے کے لئے امکان بھر جدوجہد کی۔ میں نے غریب اور محنت کش، فاقہ زدہ طبقہ کی محتاجی اور ستم رسیدگی پر ہزار داماں چاک کئے، اور سرمایہ داری، زمینداری، اور ہر قسم کی جاہلانہ مفاد پرستی کو خدا کے نظامِ ربوبیت سے بدلنے کے لئے رات دن ایک کر دیا۔ میں نے اُمتِ مرحومہ کو سلطانی و مُلّائی و پیری کے پنجۂ استبداد سے چھڑانے کے لئے فکری جہاد کیا، اور اس کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔ میں نے یہ سب کچھ قرآن کی طرف سے عائد کردہ فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے کیا۔ اس لئے میں اس کے عوض نہ ستائش کا متمنی ہوں نہ صلہ کا امیدوار۔

جھوٹا پراپیگنڈہ

اس جدوجہد اور سعی و کاوش میں میرے خلاف جس قدر جھوٹا پروپیگنڈا کیا گیا، اور کیا جا رہا ہے، اُس کی ایک تازہ مثال ملاحظہ کیجئے۔ روزنامہ "انجام" کراچی کا ایک ذمہ دار اخبار ہے۔ اس نے اپنی ۵ مارچ کی اشاعت میں عائلی قوانین سے متعلق آرڈی ننس پر اپنے افتتاحیہ میں تبصرہ کیا ہے۔ وہ اس میں لکھتا ہے:-

"سابقہ حکمرانوں نے ۱۹۵۵ء میں مسلمانوں کے شخصی و عائلی قوانین پر نظرِ ثانی کے لئے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین مرحوم کی زیرِ صدارت ایک کمیشن مقرر کیا تھا جس میں علمائے اہلِ سنت والجماعت کے نمائندے کی حیثیت سے جناب مولانا احتشام الحق تھانوی شریک تھے۔ اس میں ایک خاص نقطۂ خیال کے حامل، یا صاف الفاظ میں احادیثِ رسولِ کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) کے منکر، مسٹر غلام احمد پرویز بھی شامل کئے گئے تھے۔ اور چونکہ پاکستان میں ننانوے فی صد سے بھی زیادہ اکثریت احادیثِ مقدسہ کو قرآن مجید کی تفسیر و تشریح اور قالبِ اسلام کی رُوح سمجھتی ہے، اس لئے اکثر و بیشتر پاکستانی اخبارات نے اس نامزدگی کی مخالفت کی تھی۔"

اور ساری دنیا جانتی ہے کہ "مسٹر غلام احمد پرویز" بیچارے کو اس کمیشن سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ میں ان مخالفتوں کی پرواہ کئے بغیر اپنے فریضہ کی سرانجام دہی میں برابر مصروفِ تگ و تاز رہا، اس یقینِ محکم کے ساتھ کہ خدا کا فیصلہ ہے کہ حق، آخر الامر غالب آ کر رہتا ہے۔ بایں ہمہ مجھے اس کا تصور بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میری یہ حقیر سی کوششیں میری زندگی ہی میں

نتیجہ خیز ہو جائیں گی۔ لیکن آج میرا سرِ نیاز اُس بارگاہِ صمدیت کے آستانۂ عالیہ پر سجدہ ریز ہے، جس کی عاجز نوازیوں کے تصدق مجھے خود اپنی توقعات کے خلاف ایسی عظیم سعادت نصیب ہو گئی۔ اور میں نے یہ نشیدِ بہار اپنے کانوں سے سُن لی کہ مظلوم انسانیت کو پھر سے قرآنی حقوق دیئے جائیں گے۔ بارِ الٰہا! تیری ان گہربار نوازشات کا کس طرح شکریہ ادا کیا جائے!!

لیکن برادرانِ من! یہ میری تنہا کوششوں کا نتیجہ نہیں۔ اگر آپ احباب میرے دست و بازو نہ بنتے تو ہمیں یہ مبارک

ہدیۂ تبریک

دن دیکھنا کیسے نصیب ہوتا۔ اس لئے اس جشنِ مسرت میں آپ سب احباب میرے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ قرآن کے شیدائیو! تمہیں ہزار ہزار مبارک ہو کہ اللہ کے سحابِ کرم نے تمہاری کشتِ آرزو کو اس طرح لالہ زار اور پُربہار بنا دیا۔ تم وجد و مسرت سے جھُومو۔ خوشیوں کے جھولے جھولو۔ تبریک و تہنیت کے گیت گاؤ۔ ایک دوسرے پر مبارکبادیوں کے پھُول برساؤ اور ملّتِ پاکستانیہ کو دعوت دو کہ

بیا تا گُل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

برادرانِ من! جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے اس وقت تک ملک میں جس قدر اصلاحی قدم اٹھائے گئے ہیں، وہ کاملۃً قرآن کے مطابق نہیں، لیکن میں نے اس کے باوجود اِن پُرمسرت و تہنیت کے نغمات اس لئے پیش کئے ہیں کہ ان کا رُخ اس منزل کی طرف ضرور ہے، جہاں آخرالامر قرآن لیجانا چاہتا ہے۔ ابتدائے کار کے لئے یہ بھی از بس غنیمت ہے کہ

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں ٭ گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل ٭ محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

اس سے یہ حقیقت بھی نمایاں ہو جاتی ہے کہ زمانے کے تقاضے مجبور کر رہے ہیں کہ دنیا کی ٹھوکروں کا ٹھکرایا ہوا انسان پھر سے خدا

زمانے کے تقاضے

کے دروازے پر دستک دے۔ اب ملوکیت، سرمایہ داری، خانقاہیت، ملائیت، غرضیکہ مفاد پرستیوں کی کوئی قوت بھی زمانے کے سیلِ رواں کے سامنے روک بن کر کھڑی نہیں ہو سکتی صدیوں کی کچلی ہوئی انسانیت اب ہر طاغوتی قوت سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گُل کے نکھار کا موسم

اب چمنِ عالم کی ہر شاخ جوشِ نمو سے بیتاب ہے۔ اب یہ جُوئے رواں کسی کے روکے رُک نہیں سکتی۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ اب پُوری فضا کس طرح قرآن کی آواز سے معمور ہو رہی ہے۔ وہ آواز، جس کا کچھ عرصہ پہلے زبان تک لانا جرمِ عظیم سمجھا جاتا تھا، اب کس طرح، حکومت کے کاشانوں اور عدالت کے ایوانوں تک سے فردوسِ گوش بن رہی ہے۔

اب وہی حرفِ جُنوں سب کی زباں ٹھہری ہے ٭ جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

زمانے کے اس تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے حالات میرے اس یقین کو محکم تر کئے جاتے ہیں کہ اب وہ وقت دور نہیں جب قرآن کا مہرِ عالمتاب ساری دنیا کو آئینہ پوش بنا دے اور "زمین اپنے نشو و نما دینے والے کے نور سے جگمگا اُٹھے"۔ اے کاش! ہمارے قدامت پرست طبقے کو بھی کوئی اتنا سمجھا سکے کہ

ہے اب بھی وقت زاہد۔ ترمیم زہد کر لے
سُوئے حرم چلا ہے انبوہ بادہ خواراں

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ سعادت ان کے حصے میں نہیں آسکے گی، اس لئے کہ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا۔ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ (۲۷/۱۴) "وہ ظلم و تکبر سے اس کا انکار کئے جاتے ہیں، حالانکہ ان کے دل اندر سے اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔ تو دیکھو! معاشرہ میں فساد پیدا کرنے والوں کا انجام کیا ہوا"۔

حُدی را تیز تر می خواں

برادرانِ عزیز! چونکہ میں اپنا تفصیلی خطاب آج شام کی نشست میں پیش کرنے والا ہوں، اس لئے اس خطاب کو مختصر کرنا چاہتا ہوں۔ اس مقام پر میں آپ کی خدمت میں ایک بنیادی نکتہ پیش کروں گا۔ دنیا کے عام پروگراموں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جُوں جُوں وہ کامیابی کے قریب پہنچتے جاتے ہیں سفر کی صعوبتیں کم ہوتی جاتی ہیں۔ لیکن قرآنی نظام کے پروگرام کی کیفیت یہ ہے کہ اس میں کامیابی و کامرانی مزید ذمہ داریوں کا موجب بن جاتی ہے۔ سورۂ والنصر اس کی زندہ شہادت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا۔ جب اللہ کی نصرت قریب آجائے اور فتح و کامرانی سامنے کھڑی دکھائی دے اور تو دیکھے کہ لوگ فوج در فوج نظامِ خداوندی میں داخل ہو رہے ہیں، تو یہ نہ سمجھو کہ بس اب ہمارا کام ختم ہو گیا۔ اب ہمیں اطمینان کی نیند سو جانا چاہیے۔ نہیں۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا (۱۱۰/۳) اس وقت نظامِ خداوندی کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لئے اور بھی زیادہ سرگرمی سے مصروفِ عمل ہو جاؤ، اور مخالف قوتوں سے حفاظت طلبی میں اور بھی شدت سے کوشش کرو۔ تم یہ کرو اور پھر دیکھو کہ خدا کی رحمتیں کس تیز خرامی سے تمہاری طرف لوٹ کر آتی ہیں۔

یعنی جس وقت یہ پروگرام منزل تک پہنچ جائے اور اسے قبولیتِ عامہ حاصل ہو جائے تو اس کے بعد بھی تمہاری جدوجہد کا سلسلہ جاری رہے گا۔ ہمارے سامنے تو ابھی منزل آئی نہیں، ابھی صرف اس کے دھندلے سے نقوش دکھائی دیئے ہیں۔ اس لئے ہمارے لئے ابھی بہت کام باقی ہے۔ آپ صرف اتنا دیکھئے کہ آپ نے جو تھوڑی بہت کوشش کی ہے، اُس کا نتیجہ کس قدر حوصلہ افزا اور اطمینان بخش ہے۔ اگر ہم اپنی کوششوں کی رفتار اور تیز کر دیں تو پھر سوچئے کہ ان کے نتائج کس قدر تحیر انگیز اور مسرت خیز ہوں گے۔ آپ ذرا سی ہمت اور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ کس طرح حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ

نفسِ بادِ صبا مشک فشاں خواہد شد　　عالم پیر دگر بار جواں خواہد شد

آخری اپیل

آخر میں، میں اپنی اُس مخلصانہ اپیل کو ایک بار پھر دُہراؤں گا جسے میں ہر سال آپ کی خدمت میں پیش کیا کرتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ

(۱)۔ اپنے ذہن میں کسی غیر قرآنی تصور و خیال کو جاگزیں نہ ہونے دو۔

(۲)۔ اپنے قول سے ہی نہیں بلکہ اپنے عمل سے بھی ثابت کرو کہ قرآن کی تعلیم انسان کو کس بلند مقام پر لے جاتی ہے۔

(۳)۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دو۔ لیکن جو کچھ کرو خالصتہً لوجہ اللہ کرو۔ اس میں کسی ذاتی مفاد یا بدلہ کو دخل انداز نہ ہونے دو۔

(۴)۔ آپ سے کسی قسم کی کوئی حرکت ایسی سرزد نہ ہونے پائے جس میں فرقہ پرستی یا پارٹی بازی کا شائبہ تک بھی پایا جائے۔ اپنے دامن کو ان خاردار جھاڑیوں سے قطعاً نہ اُلجھنے دو۔

(۵)۔ اپنے وقت اور توانائی کو فضول بحث و تمحیص میں ضائع نہ کرو۔ قرآنی تعلیم کو صرف اُن لوگوں کے سامنے پیش کرو جو علم و بصیرت سے سمجھنے اور سنجیدگی سے اس پر غور کرنے کے لئے تیار ہوں۔

(۶)۔ ہر رات سونے سے پہلے یہ سوچو کہ آپ نے:۔

۱۔ دن بھر میں قرآنی احکام و تعلیم کے خلاف تو کوئی کام نہیں کیا۔ اور

۲۔ آپ نے کسی دُکھی انسان کو سکھ پہنچانے کے لئے کیا کیا ہے۔ یاد رکھئے! انسانیت کی بے لوث خدمت، بلند ترین مقصدِ زندگی ہے۔

(۷)۔ اور آپس میں محبت اور پیار اور مودّت و الفت کے ساتھ رہو، کہ دنیا میں قرآنی رشتے سے زیادہ پاکیزہ اور گہرا رشتہ اور کوئی نہیں۔

اللہ آپ کو خوش و خرم رکھے اور آپ کے عزائم کو کامیابی عطا فرمائے۔

والسلام

بسم اللہ

فردوسِ گم گشتہ

(جس کی تلاش میں یورپ مارا مارا پھرتا ہے)

محترم پرویز صاحب کی تقریر جس سے انہوں نے طلوعِ اسلام کنونشن (۱۹۶۱ء) سے خطاب کیا

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام

۲۵/بی گلبرگ، لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فردوسِ گم گشتہ

(جس کی تلاش میں یورپ مارا مارا پھرتا ہے)

جب یورپ میں انسانی شعور نے آنکھ کھولی تو اس نے دیکھا کہ زندگی کے ہر شعبہ پر ایک مذہب مسلط ہے جسے عیسائیت کہا جاتا ہے۔ (واضح رہے کہ یہ مذہب وہ نہیں تھا جو اللہ کی طرف سے حضرت عیسےٰؑ کو ملا تھا۔ یہ وہ مذہب تھا جسے بعد میں انسانوں نے خود وضع کر کے اس کی نسبت حضرت عیسےٰؑ کی طرف کر دی تھی)۔ یہ مذہب علم و بصیرت کا دشمن، عقل و فکر کا حریف اور سائنٹفک ریسرچ کے راستے میں سب سے بڑی روک تھا۔ دنیا سے نفرت اور ہر مادی علائق سے قطع تعلق، اس کی تعلیم کے بنیادی ستون تھے۔

عیسائیت سے بغاوت ظاہر ہے کہ اس قسم کا مذہب اُس وقت تک تو چل سکتا ہے جب تک انسان علم و عقل سے کام نہ لے۔ لیکن جب وہ عقل و بصیرت سے کام لینے لگے، اور زندگی کے میدان میں آگے بڑھنا چاہے تو پھر وہ ایسے مذہب کی راہ نمائی کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ اس ضمن میں مغرب کا مشہور مفکر وھائٹ ہیڈ اپنی کتاب (ADVENTURES OF IDEAS) میں رقمطراز ہے کہ:۔

"انجیل میں جس قسم کا اخلاقی ضابطہ دیا گیا ہے اُسے اگر موجودہ معاشروں میں نافذ کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ فوری موت کے سوا کچھ نہ ہوگا۔"

اور تہذیب کا مؤرخ (DORSEY) اپنی کتاب (CIVILISATION) میں لکھتا ہے:۔

"آج لاکھوں انسانوں کے نزدیک عیسائیت شکست خوردوں کا مذہب ہے۔ وہ اس مذہب کی قبولیت سے اعترافِ شکست کرتے ہیں۔ یہاں کوئی لمحۂ قابلِ اطمینان نہیں۔ اس میں اطمینان کی آرزو باطل اور آرزوؤں کی تکمیل گناہ ہے۔ یہ اندازِ نگاہ صحیح اور تندرست زندگی کو ناممکن بنا دیتا ہے۔ اس سے انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔"

شعور کی بیداری کے بعد اس قسم کے مذہب کے خلاف ردِ عمل لازمی تھا۔ یہ ردِ عمل ہوا، اور اُسی شدت کے ساتھ ہوا

ردِ عمل

جس شدت سے اس سے پہلے اُن پر مذہب مسلط تھا۔ لیکن جیسا کہ غصے اور انتقام کے جذبات کے تابع ہوا کرتا ہے۔ ان لوگوں سے غلطی یہ ہوئی کہ ان کا ردِ عمل عیسائیت کے بجائے خود نفسِ مذہب کے خلاف ابھرا ——— حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں وہ ایک حد تک تھے بھی سچے۔ ان کے سامنے عیسائیت کے علاوہ کوئی اور مذہب تھا ہی نہیں۔ اور اگر کہیں تھا تو وہ عیسائیت سے چنداں مختلف نہیں تھا۔ بہرحال مذہب کے خلاف ان کی طرف سے شدید ردِ عمل ہوا۔ اور انھوں نے ہر اُس چیز سے انکار کر دیا جسے مذہب کی طرف منسوب کیا جاتا تھا ——— خدا کا انکار مستقل اقدار کا انکار۔ انسانی ذات کا انکار۔ مکافاتِ عمل کا انکار۔ حیاتِ اُخروی کا انکار ——— مذہب کے بجائے جو

مادّی نظریۂ حیات

نظریاتِ زندگی انھوں نے مرتب یا اختیار کئے اُن کا ملخّص یہ تھا کہ :-

(۱)۔ کائنات کسی نہ کسی طرح وجود میں آگئی ہے اور اب وہ اندھی فطرت کے قوانین کے مطابق خود بخود مصروفِ عمل ہے۔

(۲)۔ انسان دوسرے حیوانات ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے۔ یہ حیوانات کی طرح کھاتا پیتا، افزائشِ نسل کرتا، اور پھر مر جاتا ہے۔ موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

(۳)۔ زندگی کے تمام مسائل کا حل، عقلِ انسانی کی رُو سے کیا جا سکتا ہے۔ اور سوسائٹی کے قوانین و ضوابط ہی اس کی آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔

اس نظریۂ زندگی کا نام ' مادّی تصورِ حیات (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) ہے چنانچہ اس نظریہ کے ایک امام، ہیکل (ERNST HAECKEL) نے لکھا ہے کہ :-

" ہم دنیا کے متعلق صحیح علم، اور اس کے اہم مسائل کا صحیح حل صرف عقل کی رُو سے دریافت کر سکتے ہیں۔ عقل، انسان کے لئے نعمتِ عظمیٰ ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو اُسے حیوانات سے ممتاز کرتی ہے۔ وحی یا مستقدات کا تصور، دانستہ یا نادانستہ یکسر فریب پر مبنی ہے۔"
(RIDDLE OF THE UNIVERSE)

اور مارکس نے کہا کہ :-

" مذہب سے وہی انسان وابستہ رہ سکتا ہے، جو یا تو ابھی تک اپنے مقامِ انسانیت سے بے خبر ہے، یا جس نے اس مقام کو پا کر پھر سے کھو دیا ہے۔ مذہب مظلوموں کی سسکیاں، ایک بے فکر کی دنیا کا قلب، اور اُن حوادث کی رُوح ہے جن میں روحانیت کا نام نہیں۔ مذہب کی فنا میں حقیقی انسانی مسرّت کا راز پنہاں ہے۔ اخلاقیات۔ مذہب، مابعد الطبیعیات، اور دیگر تصورات۔ سب کے سب حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ تاریخ صرف مادّی انسان کی ہے۔"

تاریخ کا مشہور نقاد اور مبصّر سپنگلر (SPENGLER) لکھتا ہے کہ ایک چیز ہوتی ہے تصورِ حیات یا روحِ زندگی۔ اور

دوسری چیز ہوتی ہے وہ مادی پیکر جن میں اس تصور کی نمود ہوتی ہے۔ اس تصور یا رُوح کو کلچر کہا جاتا ہے۔ اور اس کے مادی مظاہر کو تہذیب۔ اس بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ یورپ کا کلچر، مادی تصورِ حیات تھا۔ اور جس طرح یہ تصور ان کی تمدنی معاشی، معاشرتی

تہذیب مغرب

سیاسی، اخلاقی زندگی میں نمودار ہوا، اس کا نام تہذیبِ مغرب ہے۔ چونکہ اقوامِ مغرب نے سائنٹفک ریسرچ سے فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لیا تھا، اس لئے دنیا کی تمام دیگر اقوام پر انھیں سیاسی تغلب حاصل ہو گیا تھا۔ اور چونکہ محکوم قوم کو حاکم قوم کی ہر ادا میں شانِ محبوبیت نظر آیا کرتی ہے۔ اس لئے اُن کی دیکھا دیکھی ان اقوام نے بھی اسی تہذیب کو اپنا لیا جسے یورپ نے اختیار کیا تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز، دنیا میں اسی تہذیب کی حکمرانی کے منشور سے ہوا۔ ہر طرف سے اس کی تعریف و توصیف کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ ہر گوشہ سے اس کی حمد و ستائش کے قصیدے سُنائی دیتے تھے۔ ہر قوم اس کی نقالی میں فخر محسوس کرتی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے ابنِ آدم نے پھر سے اس فردوسِ گم گشتہ کو پا لیا ہو جس کی تلاش میں وہ صدیوں سے مارا مارا پھر رہا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اس پچاس ساٹھ سال کے عملی تجربہ نے اس تہذیب کے متعلق یورپ کے انسان کو کس نتیجہ پر پہنچایا ہے؟ کیا اسے وہ

اس تہذیب کا ماحصل؟

انفرادی اطمینان اور اجتماعی سکون نصیب ہو گیا ہے جس کے لئے اس نے اس تہذیب کو اختیار کیا تھا؟ کیا وہ واقعی آج پہلے سے زیادہ سُکھی ہے؟ کیا اُسے وہ فردوسِ گم گشتہ مل گیا ہے جس کا خضرِ راہ اس نے اس نظریۂ زندگی کو سمجھا تھا؟ آئیے! اس سوال کا جواب خود یورپ کے مفکرین اور مدبرین کی زبان سے سُنیں کہ ان سے بہتر اور معتبر شہادت اس باب میں اور کس کی ہو سکتی ہے؟

مغرب کا ایک مفکر، ڈاکٹر میسن (J.W.T. MASON) اپنی کتاب (CREATIVE FREEDOM) میں لکھتا ہے:-

> ہم نے زندگی کی ابتداء سائنس کی کارگیری سے کی، اس وثوق کے ساتھ کہ مادی کامرانیاں زندگی کے عقدوں کو حل کر دیں گی۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم غلطی پر تھے۔ زندگی کے مسائل اتنے آسان نہیں۔"

سائنس کی تباہ کاریاں

پروفیسر جوڈ (C. E. M. JOAD) کہتا ہے:-

> "اس زمانہ میں مشین نے انسان کو بے پناہ قوت دیدی ہے۔ اور اس قوت سے وہ تعمیر و تخریب کے بے حد و حساب کام لے سکتا ہے۔ وہ چاہے تو سمندر کو پھاڑ لے اور پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر کے آسمان اس کے سامنے گرد اور کائنات سرنگوں ہے۔ لیکن اتنی قوت پا کر بھی وہ سُکھی نہیں ہوا۔ اور دُکھی ہو گیا ہے۔
> آج مشین کی طاقت انسان کو مطمئن کرنے کا کام نہیں دے رہی، بلکہ اُلٹا اسے تباہ و برباد کر رہی ہے۔"

اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کے متعلق برٹرینڈ رسل لکھتا ہے کہ:-

ہماری موجودہ مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوتوں کو تو بے حساب انداز سے مسخر کر لیا ہے، لیکن اُن قوتوں کو قطعی

متعرض نہیں کیا جو خود ہمارے اندر ہیں۔" (AUTHORITY AND THE INDIVIDUAL)

ڈاکٹر (WILLIAM BREND) اس نکتہ کی وضاحت ان الفاظ میں کرتا ہے:-

"انسان ابھی اس مقام سے بہت دُور ہے کہ وہ سیکھ سکے کہ وہ اپنے آپ پر کس طرح حکومت کر سکتا ہے۔ انسان ہر جگہ پریشانی اور بے یقینی کے عالم میں بھٹک رہا ہے۔ قدیم اقدار و عقائد ختم ہو چکے ہیں اور ان کی جگہ کسی اور چیز نے نہیں لی۔ دنیا کے بیشتر حصے پر تعمیری قوتوں کے بجائے تخریبی قوتیں چھا چکی ہیں اور انسان نے جو کچھ صدیوں سے حاصل کیا تھا وہ سب ختم ہو رہا ہے۔ انسان نے اپنے طبعی ماحول پر اچھا خاصہ قابو پا لیا ہے، لیکن اس نے اپنے جذباتی ماحول پر قابو پانا ابھی نہیں سیکھا۔"

(FOUNDATIONS OF HUMAN CONFLICT)

اس کی وجہ!

اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جب انسان کے سامنے بلند مستقل اقدار نہ ہوں۔ جب کوئی غیر متبدل اصول اس کی آزادی اور پابندی کے حدود متعین نہ کریں۔ جب زندگی کا مقصد صرف مادی مفاد اور طبعی لذات کا حصول رہ جائے۔ تو انسان اپنے حیوانی جذبات (ANIMAL INSTINCTS) کے تابع زندگی بسر کرے گا۔ یہ جذبات (INSTINCTS) تین بڑی بڑی شقوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ یعنی جذبۂ تحفظِ خویش (SELF-PRESERVATION) جذبۂ تغلب (SELF-ASSERTION) اور جذبۂ افزائش نسل (SELF-REPRODUCTION)۔ جب ہر فرد کا مطمحِ نگاہ، اپنے ان جذبات کی تسکین ہو تو انسانوں کی اجتماعی زندگی میں جس قدر تصادم و تزاحم (CLASH) واقع ہوگا، اس کی زندہ شہادت موجودہ انسانی معاشرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انسانی عقل و فکر (INTELLECT & REASON) اس کی راہ نمائی کرے گی اور اُسے اس کے جذبات کی تسکین میں بے زمام نہیں ہونے دیگی۔ لیکن یہ غلط ہے۔ عقل انسان کے اندر ایک قوت ہے جس کا کام انسانی جذبات کے تقاضوں کے لیے جواز کے دلائل (JUSTIFICATORY REASONS) بہم پہنچانا اور انہیں بروئے کار لانے کے لئے تدابیر سجھانا ہے۔

تنہا عقل کی پوزیشن

چنانچہ (H. C. WARREN) کی (DICTOINARY OF PSYCHOLOGY) میں عقل (RRTIONALISM) کی تعریف (DEFINITION) یہ لکھی ہے:-

"عقل اس ذہنی عمل کا نام ہے جو اس کام یا رائے کے لیے خوش آئند دلائل تراشے جو درحقیقت کسی اور ہی جذبہ کے ماتحت پیدا ہوا ہو، خواہ اس شخص کو جس کی عقل یہ کچھ کر رہی ہے اس کا احساس تک بھی نہ ہو کہ اس کام کا جذبۂ محرکہ کچھ اور ہے، اور یہ دلائل محض عقل کی فسوں سازی ہے۔"

پروفیسر جوڈ اس باب میں لکھتا ہے:-

"عقل اُس قوت کا نام ہے جس سے ہم اپنے آپ کو یہ دھوکا دے سکتے ہیں کہ جس بات کو ہم

صحیح مان جاتے ہیں وہ درحقیقت صحیح ہے۔ لہٰذا عقل جذبات کی لونڈی ہے اور ان کے ماتحت اسی طرح چلتی ہے جس طرح کتے کے پاؤں اس کی ناک (سونگھنے کی قوت) کے پیچھے چلتے ہیں[1]۔"

پروفیسر آئن سٹائن ہمارے دور کا سب سے بڑا ریاضی دان اور سائنسٹ تصور کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنی عمر کے آخری حصے میں ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام (OUT OF MY LATER DAYS) تھا۔ وہ اس کتاب میں لکھتا ہے:۔

"ہم نے تلخ تجارب کے بعد یہ سیکھا ہے کہ معاشرتی زندگی کی گتھیاں تنہا عقل کی رو سے نہیں سلجھ سکتیں۔ سائنس کی تحقیقات اکثر اوقات نوعِ انسانی کے لئے بڑی ہلاکت ثابت ہوئی ہیں۔ ان سے انسان کو طبعی زندگی میں آرام اور عشرت تو ضرور مل گئے لیکن اس کی داخلی دنیا میں عجیب قسم کا کرب و اضطراب پیدا ہو گیا جس سے وہ اپنے ٹیکنیکل ماحول کا غلام بن کر رہ گیا۔ اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اسے خود اپنی تباہی کے لئے بڑے بڑے سامان مل گئے .... اس لئے ہمیں تنہا عقل کو اپنا خدا نہیں بنا لینا چاہیئے۔ اس خدا کے عضلات (MUSCLES) تو بہت مضبوط ہیں لیکن اس کی ذات (PER-SONALITY) نہیں ہے۔ عقل ذرائع و اسباب پر تو خوب نگاہ رکھتی ہے، لیکن مقاصد و اقدار کی طرف سے بالکل اندھی ہوتی ہے۔"

یہ ہے (دنی کے بقول) وہ عقل جسے تہذیبِ مغرب نے اپنا امام بنایا تھا۔ اس کا جو نتیجہ نکلا، اس کے متعلق (DORSEY) لکھتا ہے کہ:۔

"ہماری موجودہ تہذیب اپنے قومی، معاشی، عائلی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی نظام کے ہر شعبے میں حماقت، جہالت، فریب اور ظلم کا مستقل مظاہرہ ہے۔"

اس دورِ تہذیب و تمدن اور قدیم عہدِ جہالت و بربریت میں جو فرق ہے اسے (ALDOUS HUXLEY) کے الفاظ میں سنئے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"اس باب میں دورِ جاہلیت اور عہدِ حاضر میں بس فرق یہ ہے کہ ہم کھلے ہوئے تشدد کی دنیا سے فریب کاری کی دنیا کی طرف بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔" (ENDS AND MEANS)

یعنی عہدِ جاہلیت کا وحشی انسان جو کچھ کھلے بندوں کرتا تھا، ہمارے زمانے کا مہذب انسان وہی کچھ عقلِ حیلہ جو کی فریب کاریوں کے پردے میں کرتا ہے۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

جہانِ مغرب کے بت کدوں میں، کلیساؤں میں، مدرسوں میں
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقلِ عیار کی نمائش

---

[1] جب عقل وحی کی روشنی میں چلتی ہے تو اس سے کس قدر تعمیری کام سر انجام پا سکتے ہیں۔ اس کے متعلق بعد میں لکھا جائے گا۔

یہ تو ہے اس تہذیب کے ہاتھوں انسانی معاشرہ کی حالت۔ اس نے افراد کے ساتھ کیا کیا ہے۔ اس کا نقشہ اس سے

افراد کی بیکلی

بھی بھیانک اور ہولناک ہے۔ آپ نے ڈاکٹر ینگ (JUNG) کا نام سنا ہوگا۔ وہ عصرِ حاضر کا مشہور علم النفس کا ماہر ہے۔ اس نے اپنی عمر بچوں اور نوجوانوں کی نفسیات کے مطالعہ میں گزاری ہے۔ وہ اپنی مدت العمر کے تجربہ کے بعد دَورِ حاضر کے انسان کے متعلق جس نتیجہ پر پہنچا ہے اُسے اس نے اپنی کتاب MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL میں ان الفاظ میں قلمبند کیا ہے:۔

"عصرِ حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں یعنی اُن حوادث کے مقابلہ میں ہراساں جن پر وہ اپنے دَور کی سیاسی اور معاشی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی حالت۔ اور اگر وہ اس خارجی دنیا سے ہٹ کر اپنی داخلی دنیا کی طرف بھاگتا ہے تو وہاں اُسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں"۔

اقبالؒ نے مدت ہوئی عہدِ حاضر کے انسان کی قلبی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا تھا۔

عشق ناپید و خرد می گزدش صورتِ مار — عقل کو تابعِ فرمان نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

یورپ میں اس تہذیب پر بڑھاپے کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ لیکن امریکہ میں یہ ہنوز اپنے شباب پر ہے۔ وہاں کیس قسم

امریکہ کی حالت

کی نسل پیدا کر رہی ہے۔ اس کے متعلق وہاں کے مشہور اہلِ قلم (LEWIS MUMFORD) کا بیان ملاحظہ کیجئے۔ وہ اپنی کتاب (FAITH FOR LIVING) میں لکھتا ہے:۔

"امریکہ میں ہم نے ایک نئی نسل پیدا کی ہے۔ عمدہ توانائی، خوبصورت جسم، لیکن دل بالکل خالی۔ وہ نسل جس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ...... یہ نوجوان، یہ مہذب وحشی حیوانوں کی سطح پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کبھی دھوپ میں کھڑے آفتابی غسل کر رہے ہیں۔ کبھی بیکار جنسی ہیجان کی تحریک پر ناچنے لگ جاتے ہیں ...... یہ لوگ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، شادی کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، اور مر جاتے ہیں۔ ایسی زندگی جی کر جو اگر کامیاب ہے تو زیادہ سے زیادہ حیوانی لذتیں حاصل کرنے کی، اور اگر ناکام ہے تو حسد، خوف اور پریشانی کی۔ حیوانی سطح کی لذتوں کے علاوہ انہیں ہر طرح کی زندگی سے نفرت ہے۔ انہیں ان لذتوں سے محروم کر دیجئے تو ان کے لئے جینا، بالِ دوش ہو جائے"۔

تہذیبِ مغرب کا سب سے بڑا مایۂ ناز کارنامہ اس کا سیاسی نظام سمجھا جاتا ہے۔ اس نظام کی بنیاد نیشنلزم پر

نیشنلزم کی تباہ کاریاں

پر ہے اور انداز حکومت جمہوریت۔ نیشنلزم کا جذبۂ محرکہ حیوانات کی (HERD INS-TINCT) ہے جس کی رو سے ہر حیوان محسوس کرتا ہے کہ اگر وہ تنہا رہیگا تو غیر محفوظ ہوگا اور گلے کے ساتھ رہیگا تو خطرات سے مامون ہوگا۔ اسی جذبہ کے ماتحت انسانی افراد نیشن کا جزو بنکر رہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر نیشنلزم کی عمارت بھی جذبۂ تحفظ خویش (SELF-PRESERVATION) پر استوار ہوتی ہے۔ اس جذبہ کے ماتحت جس قسم کا تصادم افراد میں ہوتا ہے، اسی قسم کا اقوام میں ہوتا ہے۔ یعنی اب افراد کی جگہ اقوام ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتی ہیں۔ لندن یونیورسٹی کا پروفیسر الفریڈ کوبن اس ضمن میں لکھتا ہے :-

"قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے، اور عداوت پر پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اُس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبۂ عداوت پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جونہی کوئی قوم اپنے حق خود مختاری کو مستحکم کر لیتی ہے تو وہ ان اقوام کا گلا دبانا شروع کر دیتی ہے، جو اپنے لئے حق خود مختاری کی مدعی ہوں۔"

(THE CRISIS OF CIVILISATION)

تاریخ قومیت کا عالم (FREDRICK HERTZ) اپنی کتاب (NATIONALITY IN HISTORY AND POLITICS) میں لکھتا ہے :-

"تاریخ بتاتی ہے کہ مختلف اقوام میں باہمی لڑائیوں کا سبب اس کے سوا شاید ہی کچھ اور ہو کہ یہ قومیں انسانوں کی مختلف جماعتیں تھیں جنھوں نے اپنے اپنے نام الگ رکھ لئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ (مثلاً) ایک انگریز کے دل میں کسی فرانسیسی، ہسپانوی یا اطالوی کا نام نفرت اور حقارت کا خیال پیدا کر دیتا ہے۔"

برٹرینڈ رسل اس باب میں لکھتا ہے :-

"ہمارے زمانے میں جو چیز معاشرتی روابط کو قومی حدود سے آگے بڑھانے میں مانع ہے، وہ نیشنلزم ہے۔ اس لئے نیشنلزم نوع انسانی کی تباہی کے لئے سب سے بڑی قوت ہے۔ پھر تماشا یہ ہے کہ ہر شخص محسوس کرتا ہے کہ دوسرے ملکوں کی نیشنلزم بڑی خراب چیز ہے، لیکن اس کے اپنے وطن کی نیشنلزم بہت اچھی ہے۔"

(THE HOPE FOR A CHANGING WORLD)

آلڈس ہکسلے اس مسلک کے متعلق لکھتا ہے :-

"نیشنلزم ایک بُت پرستانہ اور مشرکانہ مذہب کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ ایسا مذہب جو فساد اور تفرقہ انسانیت کے لئے ایسا طاقتور ہے کہ کوئی توحید پرست مذہب فلاح و وحدتِ انسانیت کے مقصد کے حصول کے لئے اس مذہب کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔"[1]

---

[1] اپنے وطن کی حفاظت دو چیزیں ہیں؛ نیشنلزم اور مسلک اسلامی۔ قرآن کریم مستقل اقدار انسانیت کی حفاظت کیلئے وطن کی حفاظت ضروری قرار دیتا ہے لیکن انسانیت سے نفرت سکھاتا نہیں۔

یہ ہے نیشنلزم کا وہ مسلک جسے مغرب نے یہ سمجھ کر اختیار کیا تھا کہ اس سے نوعِ انسانی کی سیاسی اور تمدنی زندگی کے مسائل حل ہو جائیں گے۔ اس خرابی کی بنیادی وجہ بھی وہی مادی تصورِ حیات ہے جس کی رُو سے کوئی قوم مستقل اقدار یا غیر متبدل اصولوں کی پابند نہیں ہوتی۔ (MY COUNTRY-RIGHT OR WRONG) ہر قوم پرست کا عقیدہ ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ

اخلاقی اصولوں سے بے اعتنائی

اپنے ملک یا اپنی قوم کے مفاد کے تحفظ کے لئے کسی قاعدے اور قانون یا ضابطہ اور اصول کی پرواہ نہیں کرتا۔ اس بنا پر (WALPOLE) نے کہا تھا کہ:۔

"نیک آدمی کسی بڑی سلطنت کو بچا نہیں سکتے، اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے نیک آدمی وہاں تک نہیں جا سکتے"۔

اس حقیقت کو اٹلی کے مدبر (COVOUR) نے بہتر ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:۔

"اگر ہم اپنی ذات کے لئے وہی کچھ کریں جو ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے تو ہم کتنے بڑے شیاطین کہلائیں"۔

اب رہا جمہوری طرزِ حکومت، سو مغربی جمہوریت کے معنے یہ ہیں کہ ایک قوم کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کا جی چاہے

مغربی جمہوریت کی فساد انگیزیاں

قانون بنالے۔ ان کے اوپر کوئی اور اقتدار نہیں ہوتا، نہ ہی وہ اپنے حق قانون سازی میں اپنے بنائے ہوئے قواعد و ضوابط کے علاوہ کسی اور حدود و قیود کی پابند ہوتی ہے۔ اس طرزِ حکومت کا نتیجہ کیا ہے؟ اس کے متعلق کیمبرج یونیورسٹی کا پروفیسر (A. C. EWING) اپنی کتاب (THE INDIVIDUAL, THE STATE AND WORLD-GOVERNMENT) میں لکھتا ہے کہ:۔

"اگر روسو عہدِ حاضر میں جمہوری نظام کے عملی تجربہ سے پہلے اپنی کتاب نہ لکھتا تو وہ نظامِ جمہوریت کے متعلق کبھی ایسی خوش فہمی سے کام نہ لیتا"۔

یا اس لئے کہ مشہور اطالوی مدبر میزینی (MAZZENI) کے الفاظ میں:۔

"اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدارِ اعلیٰ نہ ہو تو پھر کونسی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو کمزوروں کو طاقتور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے"۔

ظاہر ہے کہ جس نظام کی بنیاد ہی مفاد خویش کے تحفظ اور مصلحت بینی کے مسلک پر ہو، اور جس میں حق و صداقت کو اپنے فیصلوں کے پرکھنے کا معیار نہ قرار دیا جائے، وہ نظام کبھی دیرپا نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں تہذیب کا مشہور مؤرخ بریفالٹ (BRIFFAULT) اپنی شہرۂ آفاق تصنیف (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے:۔

"انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ خواہ

اس باطل نظام کو کیسے ہی حسن تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط، اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی"۔

اقبالؒ کے الفاظ میں:۔

تدبر کی فسوں سازی سے قائم رہ نہیں سکتا　　　　جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہو

نظامِ کارخانہ داری

جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے مغرب کے مشینی دور (نظام کارخانہ داری) نے اس باب میں اس قدر تباہی پیدا کی ہے کہ اس سے انسانیت کی رُوح کانپ اٹھتی ہے۔ اس نظام کی بنیاد کس تصور پر ہے؟ اس کے متعلق (ERIC GILL) اپنی مشہور کتاب (MONEY AND MORALS) میں لکھتا ہے کہ:۔

"ہمیں کارخانوں میں انسانوں کی ضرورت نہیں۔ مشینیں ان سے کہیں بہتر ہیں۔ ان کی ایجاد سے انسانی محنت میں بڑی بچت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہمیں مشین کو نہیں انسان کو ختم کرنا چاہیئے۔ یہ انسان جنہیں ہم دنیا سے مٹا دینے کے خواہشمند ہیں، وہ انسان ہیں جو کارخانوں میں کام کرتے ہیں، نہ کہ وہ انسان جو کلرکی محنتوں میں پستے ہیں۔ یہ انسان تو ہمارے ساتھی ہیں، ہمارے دوست ہیں، کیونکہ ہمارا مال خریدتے ہیں۔ آجکل سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ چیزوں کے پیدا کرنے میں انسانی محنت میں کس طرح زیادہ سے زیادہ بچت کی جائے۔ اور ان چیزوں کے استعمال کرنے والوں کی تعداد میں کس طرح زیادہ سے زیادہ اضافہ کیا جائے اور ان کے خریدنے کی قوت کو بڑھایا جائے۔ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے۔ تجربہ بھی یہی ہے اور منطق بھی یہی"۔

بعض لوگوں نے سمجھا کہ یہ ساری خرابی نظام سرمایہ داری کی ہے۔ اور اشتراکی نظام (کمیونزم) اس کا حل ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ نظام سرمایہ داری انسانیت کے لئے پیامِ مرگ ہے۔ لیکن کمیونزم اس کا حل کس طرح پیش کر سکتی تھی؟

کمیونزم کی خرابیاں

خرابی کی اصل بنیاد یہ تصور ہے کہ انسان کے اوپر کوئی مستقل اقدار نہیں جن کی پابندی اس پر لازم ہو۔ کمیونزم کی ساری عمارت اسی بنیاد پر استوار ہوتی ہے۔ لینن اپنی ایک تقریر میں نوجوانوں کو مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے:۔

"ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ پارٹی کے مفاد کی جنگ کے تابع رہنا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظامِ معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں استعمال کرنا ضروری سمجھا جائے عین اخلاق ہے۔ اشتراکیوں کا اخلاق و شریعت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت کا استحکام کیں صورت میں ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے، سب ناجائز ہے۔ چنانچہ پارٹی کے مفاد کی

خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی عین حق و صداقت ہے۔ نہیں! بلکہ دشمنوں کے خلاف کذب و افترا ہی بعض اوقات سب سے اہم حربے ہوتے ہیں۔"

یہ فریب دہی اور دروغ بافی دشمنوں کے خلاف ہی نہیں، بلکہ عندالضرورت خود اپنی جماعت کے خلاف بھی انہی حربوں سے کام لیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ (GOLLANCZ) اپنی کتاب (OUR THREATEND VALUES) میں لکھتا ہے کہ Dr. G (LUCKUZ سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی لیڈروں کے لئے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی فریب دہی سے کام لیں؟ اس نے جواب میں کہا کہ:-

"اشتراکی اخلاق کی رُو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عندالضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جاسکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔"

لہٰذا سوال نہ نظامِ سرمایہ داری کا ہے نہ اشتراکیت کا۔ نہ جمہوری نظامِ حکومت کا نہ ڈکٹیٹرشپ کا۔ اصل سوال ہے اس تہذیب کا جو مادی تصورِ حیات کی پیداوار ہے، اور جس کا شکار تمام اقوامِ مغرب اور ان کی دیکھا دیکھی دیگر اقوامِ عالم ہو چکی ہیں۔

یورپ کا موجودہ ردِعمل

اب سوال یہ ہے کہ مادی تصورِ حیات کی پیدا کردہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا ستایا ہوا مغربی انسان اب اپنے لئے کس قسم کی زندگی کی تلاش میں ہے؟ آپ جب ان تصورات، احساسات اور خیالات پر غور کریں گے جو گزشتہ پچاس سال کے تلخ تجربہ کے بعد یورپ کے مفکرین و مدبرین کے دل میں پیدا ہو رہے ہیں تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ اب ان کے سامنے جس قسم کی زندگی کے دھندلے سے نقش اُبھر رہے ہیں وہ ویسے ہی ہیں جیسے آج سے چودہ سو سال پہلے قرآنِ کریم نے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود اور امن و سکون کا ضامن قرار دیا تھا۔ قرآن نے کہا تھا کہ مادی تصورِ حیات باطل ہے۔ انسان کی طبعی زندگی بے شک انہی قوانین کے تابع ہے جن کے تابع دیگر حیوانات کی زندگی ہے۔ لیکن انسان میں ایک اور شے بھی ہے، جو کسی حیوان میں نہیں۔ یہ شے انسان کی ذات (HUMAN PERSONALITY) ہے۔

انسانی ذات کا اقرار

انسانی جسم ہر آن بدلتا ہے لیکن انسانی ذات تغیر ناآشنا ہے۔ مشہور روسی مفکر بارڈیو (NICHOLES BERDYEAU) اس باب میں لکھتا ہے:-

"دنیا میں جس قدر تغیرات رونما ہوتے ہیں ان کے متعلق انسان کا انداز نگاہ دُہرا ہونا چاہیئے۔ زندگی تغیرات کا نام ہے، اور جدّت کے بغیر زندگی کچھ نہیں۔ لیکن صرف تغیر کا تصور فریب انگیز ہے۔ تشخّصِ ذات کے لئے تغیر اور جدّت کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن اس میں ایک ایسی شے بھی ہے جو مستقل اور تغیر ناآشنا

ہے۔ لہٰذا اپنی نشوونما میں انسان کو خود اپنے آپ سے فریب دہی نہیں کرنی چاہیئے۔ یعنی اس مستقل شے کو کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے جو اسے ابدی طور پر ملی ہے۔ زندگی کے لئے یہ چیز نہایت ضروری ہے کہ تغیرات کے اس پیہم عمل سے جس سے جدت نمودار ہوتی ہے ذات کے ثبات کا امتزاج کیا جائے۔"

(THE DIVINE AND HUMAN)

حیات بعد الممات

قرآن نے کہا تھا کہ اگر انسانی ذات کی مناسب نشوونما ہو جائے تو انسان کو حیاتِ جاوید حاصل ہو جاتی ہے۔ انسان کی طبیعی موت سے انسانی ذات نہیں مرتی۔ یہی وہ بنیادی تصور ہے جس پر دین کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے مشہور روسی مفکر اوسپنسکی (P.D. OUSPENSKY) اپنی کتاب (IN SEARCH OF THE MIRACULOUS) میں اپنے استاد گرجیف کے الفاظ میں لکھتا ہے:۔

"اگر انسان ہر آن بدلتا رہے۔ اگر اس میں کوئی ایسی شے نہ ہو جو خارجی تغیرات سے متاثر نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں جو موت کا مقابلہ کر سکے۔ عام حالات میں ہم ہر لمحہ مرتے رہتے ہیں لیکن اگر انسان اپنے اندر مستقل انا کو نشوونما دے لے تو یہ خارجی تغیرات سے غیر متاثر رہ سکتا ہے۔ اور اس طرح طبیعی جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہ سکتا ہے۔"

اخلاقی اقدار

قرآن کریم نے کہا تھا کہ جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کی نشوونما کے لئے قوانین مقرر ہیں۔ اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لئے بھی اصول متعین ہیں۔ انہیں مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار نہ ہر فرد کی ذاتی پیداکردہ ہوتی ہیں۔ نہ انہیں انسان مل کر باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔ ان کا ایک مطلق معیار (ABSOLUTE STANDARD) ہے جو کسی کے لئے نہیں بدلتا۔ جب انسان کے کسی طبیعی تقاضے اور مستقل قدر میں (TIE) پڑ جائے تو مستقل قدر کے تحفظ کے لئے جسمانی تقاضے کو قربان کر دینا کیریکٹر یا اخلاق کہلاتا ہے۔ مغرب کے مادی تصورِ حیات نے ان تمام اصولوں کا مذاق اڑایا لیکن اب دیکھئے کہ وہیں کے مفکر اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ راشڈل (RASHDAL HASTINGS) اپنی کتاب (THE THEORY OF GOUD AND EVIL) میں لکھتا ہے:۔

"اخلاقیات سے مفہوم ہی یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لئے ایک مطلق معیار ہے۔ جو ہر انسان کے لئے یکساں ہے۔ یہ اقدار مستقل ہیں۔ مستقل اقدار کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کرے کہ مستقل قدر کیا ہے۔ انہیں عالمگیر ہونا چاہیئے جنہیں ہر شخص تسلیم کرے اور ان کا معترف ہو۔"

وحی کی ضرورت

قرآن نے کہا تھا کہ یہ مستقل اقدار عقلِ انسانی وضع نہیں کر سکتی۔ یہ انسان کو وحی کے ذریعہ ملتی ہیں۔ مادی نظریۂ حیات عقلِ انسانی سے ماورا کسی سرچشمہ علم کا قائل نہیں تھا۔ اب دیکھئے کہ مغرب کے مفکرین اس باب میں کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ آلڈس ہکسلے اپنی کتاب (OUT OF MY LATER DAYS) میں جس کا

حوالہ پہلے بھی دیا جا چکا ہے، لکھتا ہے :-

"سائنس صرف یہ بتا سکتی ہے کہ "کیا ہے"۔ وہ یہ نہیں بتا سکتی کہ "کیا ہونا چاہیئے"۔ اس لئے اقدار کا متعین کرنا اس کے دائرے سے باہر ہے۔ سائنس کے علمبرداروں نے اکثر اوقات اس امر کی کوشش کی ہے کہ وہ سائنس کی رو سے اقدار کے متعلق قطعی فیصلہ نافذ کر دیں (یہ ان کی غلطی ہے جس کی وجہ سے) وہ مذہب کے خلاف محاذ قائم کر بیٹھتے ہیں۔ سائنس کے نزدیک بس ایک "شے" ہوتی ہے۔ اس کی دنیا میں آرزو۔ اقدار۔ خیر و شر۔ نصب العین حیات کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ سائنس نہ تو اقدار متعین کر سکتی ہے اور نہ ہی انہیں انسانی سینے کے اندر داخل کر سکتی ہے۔"

آگے چل کر یہ سائنسدان لکھتا ہے :-

"یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاتیں۔ یہ مقدس ہستیوں کی وساطت سے بذریعۂ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیادیں عقل پر نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس لئے کہ صداقت کہتے ہی اُسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔"

شہرۂ آفاق کتاب (AN ESSAY ON MAN) کا مصنف پروفیسر (ERNST CASSIRER) لکھتا ہے :-

"یہ حقیقت کہ دنیا میں عقل بڑی مبہم چیز ہے، اور اس کے فیصلے یونہی تسلیم کر لینے کے قابل نہیں ہو سکتے انسان کو کبھی معلوم نہ ہو سکتی اگر اس کی طرف وحی کی روشنی نہ آتی۔ وحی ہی نے آ کر اسے اس حقیقت سے آگاہ کیا۔ عقل اس قابل ہی نہیں کہ وہ صداقت اور حکمت کی طرف راہنمائی کر سکے۔"

مادی نظریۂ حیات کے ماتحت اوّل تو خدا کی ہستی سے یکسر انکار ہی کر دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر اسے مانا بھی جاتا ہے تو صرف اس حد تک کہ خارجی کائنات میں اس کے وضع کردہ قوانین نافذ ہیں۔ جہاں تک انسانوں کی دنیا کا تعلق ہے، اس میں اس کے قوانین کا کوئی عمل دخل نہیں۔ قرآن نے کہا تھا کہ خدا کی ہستی پر ایمان کے معنی یہ ہیں کہ تسلیم کیا جائے کہ انسان کو اس کی طرف سے راہنمائی ملتی ہے ——— ایڈنگٹن ہمارے دور کا بہت بڑا عالمِ طبیعات گزرا ہے، وہ اپنی کتاب (SCIENCE AND THE UNSEEN WORLD) میں لکھتا ہے :-

"اصل سوال خدا کی ہستی کا نہیں بلکہ اس امر کا تعین ہے کہ خدا بذریعۂ وحی انسانوں کی راہنمائی کرتا ہے۔"

یہ صاحبِ وحی ہستیاں کس قسم کی ہوتی ہیں، اس کے متعلق باردیو لکھتا ہے :-

"نبوت خدائی الہام پر مبنی ہوتی ہے۔ صاحبِ وحی، دنیا اور انسان کے مقدرات اور مستقبل کے متعلق خدا کی آواز سنتا ہے۔ حاملِ وحی اپنے آپ کو دنیا میں تنہا پاتا ہے۔ وہ جن قوموں کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرتا ہے، وہ اسے پتھر مارتی ہیں۔ لیکن وہ پھر بھی انہیں چھوڑ کر الگ نہیں ہو جاتا

یہ وحی اکتسابی نہیں ہوتی جسے ارتقائی مدارج سے حاصل کیا جا سکے۔ یہ تو ایک داخلی شے ہے۔ ایک پیغمبر کی وحی ہندوستان اور یونان کے صوفیوں کے کشف سے بالکل منفرد شے ہوتی ہے۔"

(THE DIVINE AND HUMAN)

ان ہستیوں پر ایمان انسان کی منزلِ مقصود کے لئے خضرِ راہ بنتا ہے، اور یہی ہے وہ "ایمان" جس کے فقدان سے پورپ کا نوجوان

ایمان کا فقدان

اس قدر پریشان ہے، اور جس کی تلاش میں وہ آج مارا مارا پھر رہا ہے۔ ڈاکٹر ینگ جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس باب میں لکھتا ہے:۔

"میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیۂ نفس کیا ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے زندگی کے مسائل کے لئے مذہبی زاویۂ نگاہ کی تلاش نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو ضائع کر دیا تھا جو "زندہ مذہب" انسان کو مہیا کرتا ہے۔ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دیدی جاتی جو اُن سے گم ہو چکی تھی۔ یہی ان کی دوا تھی۔

۔۔۔۔۔۔ ایمان۔ امید۔ محبت۔ نگۂ خود بیں"

ایمان کس بات پر؟ خود اپنی ذات پر، مستقل اقدار پر۔ ان اقدار کے سرچشمہ، ذاتِ خداوندی پر۔ اس کی طرف سے عطا کردہ وحی پر، اور انسانی ذات کے حیاتِ جاوید حاصل کر لینے پر۔ قرآن نے یہی ایمان کے اجزا بتائے ہیں۔ یہ ایمان، انسان اور کائنات اور انسان کے دوسرے انسانوں کے ساتھ صحیح تعلقات استوار کرنے کے علاوہ ان تضادات کو بھی رفع کر دیتا ہے، جو

داخلی تضادات کا حل

خود انسان کی اپنی ذات میں جذبات اور عقل، اور عقل اور بلند اقدار کی کشمکش سے رونما ہوتے رہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان کی پریشانی کا اصلی سبب اس کے یہی داخلی تضادات ہوتے ہیں۔ میتسن اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:۔

"اخلاق صرف اس ضابطہ کا نام نہیں جو انسان اور انسان کے درمیان تعلقات کو صحیح معیار کے مطابق طے کرتا ہے۔ بلکہ اس میں وہ ضابطہ بھی شامل ہے جس کی رُو سے انسان کے خود اپنی ذات کے ساتھ تعلقات بھی صحیح خطوط پر متشکل رہتے ہیں۔"

برگسان کہتا ہے کہ انسان کو جب تک یہ داخلی توافق حاصل نہ ہو، معاشرہ میں کبھی وحدت اور توافق پیدا نہیں ہو سکتا، اس لئے۔

"جو توازن ہمیں سطح پر نظر آتا ہے، اس سے کہیں گہرا اور حقیقی توازن انسان کی اپنی ذات کے اندر ہونا چاہیئے۔ جن معاہدات کے متعلق ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی رُو سے معاشرہ کا ایک فرد دوسرے فرد کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے، اُن کا پہلا کام یہ ہونا چاہیئے کہ وہ خود ہمیں اپنی ذات کے ساتھ مربوط کر دیں۔"

(THE TWO SOURCES OF MORALITY AND RELIGION)

نیٹشے نے اس باب میں ایک عجیب بات کہی ہے، وہ کہتا ہے کہ:۔

"جو بُرائی تم نے میرے ساتھ کی ہے اُسے تو میں معاف کر دونگا۔ لیکن جو بُرائی تم نے اپنے ساتھ کی ہے، اُسے کون معاف کریگا؟"

قرآن ایسی تعلیم دیتا ہے جس سے انسان نہ دوسرے انسان کے ساتھ برائی کرے اور نہ ہی اپنی ذات کے خلاف۔ اس سے انسان کے خارجی اور داخلی تضادات میں توافق پیدا ہوتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ یورپ کو اب پھر مذہب کی تلاش ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کے مذہب کا متلاشی

یورپ کس قسم کا مذہب چاہتا ہے؟

ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ مذہب عیسائیت تو ہو نہیں سکتا۔ اس لئے کہ عیسائیت ہی سے بھاگ کر تو اس نے مادی نظریۂ حیات اختیار کیا تھا۔ مغربی مفکرین کو اس کا تو علم نہیں کہ وہ مذہب کونسا ہے جس کی انہیں تلاش ہے۔ البتہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ جو مذہب ان کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہے اُسے کس قسم کا ہونا چاہیئے۔ دیکھئے کہ ان کے یہ تقاضے کیا ہیں اور اُسے کونسا مذہب پورا کر سکتا ہے!

جو سائنس کی تکذیب نہ کرے

اوسپنسکی کہتا ہے کہ:۔

"جو مذہب سائنس کی تکذیب کرے، اور جو سائنس مذہب کی تکذیب کرے وہ دونوں باطل ہوتے ہیں"

یعنی سچا مذہب وہ ہے کہ سائنس کے انکشافات اس کی صداقت کی دلیل بنتے جائیں۔ قرآن کریم اپنی صداقت کے ثبوت میں کہتا ہے:۔ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ (۴۱/۵۳)

"ہم لوگوں کو خارجی کائنات اور خود ان کی داخلی زندگی میں اپنی نشانیاں دکھاتے جائیں گے تاکہ یہ ان پر واضح ہو جائے کہ یہ واقعی حق ہے"۔

"خارجی کائنات کی نشانیاں" سائنس کے انکشافات کے سوا اور کیا ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن کائنات پر غور کرنے کی بار بار تاکید کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔ إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ۔ "یہ حقیقت ہے کہ ارض و سما کی پیدائش میں اور رات دن کی گردش میں صاحبانِ عقل و بصیرت کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں"۔ یعنی اُن لوگوں کے لئے الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ جو کھڑے بیٹھے لیٹے ہر وقت قوانینِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، اور کائنات کی تخلیق پر غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۸۹-۱۹۰)

اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس سلسلۂ کائنات کو یونہی رائیگاں نہیں بنایا۔ یہاں کی ہر چیز ایک مقصد کیلئے بنائی

گئی ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کیا سائنٹفک ریسرچ کا منتہیٰ یہی نہیں جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے، اور جسے مومنین کا فریضہ اور شعارِ زندگی قرار دیا ہے؟

سیکسلے اس ذیل میں لکھتا ہے کہ:۔

"ناترقی یافتہ مذہب انسانی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں بنکر حائل ہوجاتا ہے۔ لیکن ترقی یافتہ مذہب تمام انسانی قوٰی میں وحدت پیدا کر کے ان میں سے ہر قوت کے لئے اختیار واستعمال کا میدان پیدا کر دیتا ہے۔"

قرآن کریم انسانی ترقی کے میدان کی وسعت کے متعلق کہتا ہے:۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ (۴۵/۱۳) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے۔ خدا نے اُسے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے تم اٹھو اور ان سے کام لو۔"

عقل وبصیرت کا دشمن نہ ہو

یورپ کو جس مذہب کی تلاش ہے اُس کے لئے وہ دُوسری شرط یہ عائد کرتا ہے کہ وہ عقل وبصیرت کا دشمن نہیں ہونا چاہیئے۔ مغرب کے نامور مفکر لاک (LOCKE) نے اس تقاضے کو چند الفاظ میں بڑی خوبصورتی سے سمٹا دیا ہے جب وہ کہتا ہے کہ:۔

"جو شخص وحی کے لئے جگہ بنانے کی خاطر عقل وبصیرت کو باہر نکال دیتا ہے وہ وحی اور عقل دونوں کے چراغ گل کر دیتا ہے۔" (ESSAYS - BOOK IV)

ڈاکٹر آٹو (OTTO) اس ضمن میں لکھتا ہے:۔

"جب تک کوئی مذہب عقل وبصیرت کے عناصر اپنے اندر رکھتا ہے وہ تعصّب اور توہّم پرستانہ باطنیت کی پست سطح پر گرنے سے محفوظ رہتا ہے۔ یہی مذہب ہے جو انسانیت کا مذہب بن سکنے کا اہل ہوتا ہے۔" (THE IDEA OF THE HOLY)

قرآن کریم، بدترین خلائق اُن انسانوں کو قرار دیتا ہے جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔ وہ کہتا ہے کہ۔ اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ (۸/۲۲) "اللہ کے نزدیک تمام ذی حیات مخلوق میں بدتر وہ انسان ہیں جو بہرے گونگے بن کر زندگی گزار دیتے ہیں، اور عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔" وہ ایسے لوگوں کو جہنّمی قرار دیتا ہے سُورۂ اعراف میں ہے:۔ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ "او بہت سے مہذب وغیر مہذب انسان تو محض جہنم کا ایندھن بننے کے لئے ہی ہوتے ہیں۔" یہ وہ لوگ ہیں:۔ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا "وہ دل رکھتے ہیں لیکن اُس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے۔" وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا "اُن کی آنکھیں تو ہوتی ہیں لیکن وہ اُن سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔" وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا "اُن کے کان بھی ہوتے ہیں لیکن وہ اُن سے سُننے کا کام نہیں لیتے۔" اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ "یہ بظاہر انسان نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت حیوانوں

کے مانند ہیں۔ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغَافِلُوْنَ (۷/۱۷۹) "اس لئے کہ وہ علم و حقیقت سے بے خبر رہتے ہیں"۔

اس مذہب کے متعلق مغربی مفکرین یہ بھی کہتے ہیں کہ اُسے اندھی تقلید سے نہ مانا جائے، بلکہ انسان اسے خود سمجھ سوچ کر اختیار کرے۔ وھائٹ ہیڈ اس ضمن میں کہتا ہے کہ یہ قطعاً ناکافی ہے کہ انسان صرف یہ دیکھے کہ سابقہ زمانے میں کیا کچھ ہوتا رہا اور کس طرح ہوتا رہا ہے۔ اور خود بھی اسی طرح کرتا چلا جائے۔ اس اسلوبِ زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی جامد بن کر رہ جاتی ہے۔

اندھی تقلید نہ ہو

راشڈل اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔

"کیا ہم یہ سمجھیں کہ اخلاقی امور میں غور و فکر گناہِ عظیم ہے؟ کیا ہم اسے تسلیم کر لیں کہ انسان کو آنکھ بند کئے ان قواعد و ضوابط کی پابندی کئے جانا چاہیئے جنہیں وہ اپنے گرد و پیش دیکھتا ہے۔ اگر ہم ایک ثانیہ کے لئے بھی غور کریں تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ان سوالات کا جواب یکسر نفی میں ہے۔ اخلاقی تعلیم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ انسان خود سوچے۔ جو انسان خود نہ سوچے بلکہ زندگی کی تمام جزئیات میں دوسروں کی تقلید کرتا چلا جائے، اس کے متعلق سمجھ لو کہ وہ ایسا انسان ہے جس میں کیریکٹر ہی نہیں۔ بریڈلے نے کیا خوب کہا ہے کہ جو شخص اپنے ماحول سے بہتر بننے کی خواہش کرتا ہے، سمجھ لو کہ وہ حیاتِ جاوداں کی دہلیز پر کھڑا ہو گیا"۔

قرآن کریم اندھی تقلید کو انسانیت کا بدترین جرم قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا۔ "جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ وہ وحیِ خداوندی کا اتباع کریں، تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اُس مسلک پر چلتے جائیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے"۔ اس پر قرآن کہتا ہے کہ:۔ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ (۲/۱۷۰) "خواہ ان کے آباؤ اجداد نہ کچھ سوجھ بوجھ رکھتے ہوں، اور نہ ہی صحیح راستہ پر چلتے ہوں"۔ یہ پھر بھی اُنہی کی پیروی کرتے جائیں گے!

وہ وحی پر بھی بلا سوچے سمجھے ایمان لانے کی اجازت نہیں دیتا۔ چنانچہ وہ مؤمنین کی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا (۲۵/۷۳) "یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات بھی پیش کی جاتی ہیں تو وہ اُن پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے"۔ وہ غور و فکر سے کام لیتے ہیں اور علم و بصیرت کی بنا پر انہیں تسلیم کرتے ہیں۔

اصول غیر متبدل ہوں

اس مذہب کے متعلق وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس کے اصول غیر متبدل ہونے چاہئیں۔ لیکن ان اصولوں کی جزئیات زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ بدلتی رہنی چاہئیں۔

وھائٹ ہیڈ اس ضمن میں لکھتا ہے کہ:۔

"زندگی کو مستقل طور پر ایک ہی قالب میں مقید رکھنا ناممکن ہے۔ اس لئے مذہب کو بھی سائنس کی طرح بدلتے تقاضوں کا لحاظ رکھنا پڑیگا۔ اس کے اصول ابدی ہو سکتے ہیں لیکن ان اصولوں کی تعبیرات تو حالات کے ساتھ ساتھ بدلتی رہینگی۔" (SCIENCE AND THE MODERN WORLD)

پروفیسر (CASSIRER) لکھتا ہے:-

"قدیم الایام کا مذہبی تصور انسانی آزادی کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتا۔ وہ انسانی اعمال کے لئے ہی نہیں بلکہ انسانی جذبات تک کے لئے جامد اور ناقابلِ تغیر قوانین متعین کرتا ہے۔ اس سے انسانی زندگی ایک مستقل بوجھ کے نیچے دبی رہتی ہے۔ وہ قدم قدم پر "یہ کرو، یہ نہ کرو" کی زنجیروں میں جکڑی رہتی ہے۔"

قرآن کریم انسانی اعمال و جذبات کے لئے بڑا وسیع میدان کھلا رکھتا ہے۔ اس نے صرف چند احکام دیئے ہیں۔ باقی معاملات کے لئے وہ صرف حدود (BOUNDARY LINES) مقرر کرتا ہے جن کے اندر رہتے ہوئے ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق اپنے لئے آپ جزئیات متعین کرتے ہیں۔ اس کی یہ حدود غیر متبدل رہتی ہیں اور ان کے اندر مرتب کردہ ضوابط زمانے کے تقاضوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ وہ اپنے اصولوں کے متعلق کہتا ہے:۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا ۔ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۔ (۶/۱۱۵) "تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ انہیں کوئی بدلنے والا نہیں"۔ جہاں تک ان اصولوں کی روشنی میں طے کئے جانے والے ضوابط کا تعلق ہے وہ جماعتِ مؤمنین کے متعلق کہتا ہے:۔ وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (۴۲/۳۸) ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔ اس طرح غیر متبدل اور بدلنے والے عناصر کے امتزاج سے انسانی زندگی ترقی کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی جائے گی۔ قرآن کی رُو سے زندگی ایک جُوئے رواں ہے، جسے ہر آن متحرک رہنا اور آگے بڑھتے چلے جانا چاہیئے۔ وہ زندگی کے رُک جانے کے مقام کو جہنم کہتا ہے۔

عالمگیر انسانیت کا نظام

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ یورپ نے اپنے سیاسی نظام کی بنیاد نیشنلزم اور جمہوریت پر رکھی تھی اور اب وہ ان دونوں کے ہاتھوں بُری طرح تنگ آ چکا ہے۔ قرآنِ کریم نے نیشنلزم کی جگہ عالمگیر انسانیت کا نظام تجویز کیا تھا۔ یعنی ایسا نظام جس میں تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری کے افراد تصور کیا جائے۔ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً (۲/۲۱۳) اس کا بنیادی اصول ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں ثباتِ دوام صرف اُسی نظام کو حاصل ہو سکتا ہے، جو کسی ایک پارٹی، ایک گروہ، ایک نسل، ایک قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر منفعت بخش ہو۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ۔ (۱۳/۱۷)

اس قسم کے عالمگیر نظام کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ تمام کرۂ ارض کو اصولی طور پر ایک اقتدار کے تابع رکھا جائے۔ اس کے نزدیک یہ اقتدار اُن مستقل اقدار کے سوا جو خدا نے بذریعہ وحی دی ہیں کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ (اس کی تفصیل ذرا آگے چل کر "جمہوریت" کے تحت دی جائے گی)۔

اب دیکھئے کہ اس باب میں مفکرینِ مغرب کس نتیجے پر پہنچے ہیں۔ پروفیسر کوین اپنی اُس کتاب کے آخر میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے لکھتا ہے:۔

"دنیا کے مصائب کا جو حل سامنے آرہا ہے وہ یہی ہے کہ ایک عالمگیر مملکت کی تشکیل کی جائے"۔

یورپ کے مدبرین نے نیشنلزم کی پیدا کردہ مصیبتوں کا حل "لیگ اوف نیشنز" یا "متحدہ اقوام" جیسے انٹرنیشنل اداروں کے قیام میں سوچا۔ اس سلسلہ میں پولیٹیکل سائنس کے ماہر مسٹر (EMREY REVES) نے ایک مختصر لیکن بڑی جامع اور فکر انگیز کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے (THE ANATOMY OF PEACE)۔ وہ اس میں لکھتا ہے:۔

"ہم انٹرنیشنلزم سے بھی کافی کھیل چکے ہیں۔ جو مسئلہ دنیا کے سامنے پیش ہے، وہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قوموں کے حل کرنے کا ہو (وہ تو خود قوموں کا پیدا کردہ ہے) وہ مسئلہ یہ ہے کہ نیشنلزم کے نظریئے نے انسانی معاشرہ میں ایک فساد برپا کر دیا ہے۔ لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ خود نیشنلزم خواہ وہ انٹرنیشنلزم ہی کیوں نہ بن جائے، اس کا حل دریافت کر سکے۔ اس مسئلہ کا حل انسانی عالمگیریت ہے۔ یعنی ایک ایسا عقیدہ یا تحریک جس کا مقصد یہ ہو کہ وہ قومیت اور بین الاقوامیت کی سطح سے بلند ہو کر خالص انسانی سطح پر امن قائم کرنا چاہتی ہے"۔

یہی مفکر دوسرے مقام پر لکھتا ہے کہ:۔

"کھلے کھلے الفاظ میں بیسویں صدی کی قیامت خیزیوں کے بعد انسان لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اس کرۂ ارض کو کسی ایک اقتدار کے تابع لانا ضروری ہے۔ ہمارا فریضہ ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح جمہوری انداز سے اس اقتدارِ واحد کی تشکیل کریں۔ اس کے لئے ان بنیادی اصولوں کا اعلان کرنا چاہیئے جن پر یہ اقتدار متشکل ہوگا۔ اور اس کے بعد لوگوں کو اس کی طرف راغب کرنا چاہیئے تاکہ یہ مقصد خونریزی کے بغیر حاصل ہو جائے۔ اگر اس اقتدار کا حصول اس طرح ممکن نہ ہوا تو پھر تاریخ کا فولادی ہاتھ مجبور کر دیگا کہ ہم اور خونریزی کریں اور آج سے زیادہ مہلک آلاتِ حرب و ضرب وضع کریں تاکہ سب سے زیادہ طاقتور جماعت باقی دنیا کو مجبور کر کے وحدتِ اقتدار قائم کرے"۔

اوّل تو یہ ناممکن نظر آتا ہے کہ اور زیادہ مہلک ہتھیاروں سے کسی ایک جماعت کو خلیہ کلی حاصل ہو جائے۔ نظر یہی آتا ہے آتا ہے کہ اس سے پوری نسلِ انسانی دنیا سے محو ہو جائے گی۔ لیکن اگر اس طرح کسی ایک جماعت نے واحد اقتدار قائم کر بھی لیا تو

اس کی آہنی گرفت میں انسانیت کا جو حشر ہوگا اس کے تصور سے رُوح کانپتی ہے۔ قرآن کے پیش کردہ عالمگیر اقتدار کے معنی یہ ہیں کہ حکومت کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کے ہاتھ میں نہ رہے ـــــــ وہ کسی انسان کو اس کا حق ہی نہیں دیتا کہ وہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے ـــــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) یہ اقتدار ان غیر متبدل اصولوں کو حاصل ہو جو تمام نوعِ انسانی پر یکساں طور پر نافذ ہوں، اور جن میں تغیر و تبدل کا کسی کو اختیار نہ ہو۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ (۱۲/۴۰) کے یہی معنی ہیں۔ یہ موقع نہیں کہ میں ان اصولوں کو تفصیلی طور پر پیش کروں۔ اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ ان اصولوں کے لئے خود مغرب کے مفکرین اور مدبرین بےحد مضطرب و بیتاب ہیں۔

قرآنی جمہوریت

جہاں تک اندازِ حکومت کا تعلق ہے، قرآن کا اصول یہ ہے کہ مملکت کے قانون سازی کے اختیارات غیر مقید (UN-RESTRICTED) نہیں۔ وہ صرف اُن حدود کے اندر رہتے ہوئے قوانین مرتب کر سکتی ہے جو وحی کے غیر متبدل عالمگیر اصول متعین کرتے ہیں۔ ان اصولوں میں تغیر و تبدل کرنا یا انہیں بدلنا، مملکت کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے۔ مغربی تصورِ مملکت میں ـــــــ خواہ طرزِ حکومت جمہوری ہو یا آمرانہ ـــــــ قانون سازی کے اختیارات مطلق (ABSOLUTE) ہوتے ہیں، اور اسی سے وہ تمام خرابیاں پیدا ہوتی ہیں جن سے یورپ اس وقت دوچار ہے۔ میرٹین اس باب میں لکھتا ہے:-

"اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابلِ تغیر قانون نہ ہو جو انسانوں کا وضع کردہ نہ ہو، تو ہمارے پاس وہ کونسی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو حکومت بھی قائم ہو، اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے، خواہ اس کا نام بوناپارٹ رکھ لیں یا انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانۂ سطوت میں ہر ایک مستبد بن جائیگا ...... یاد رکھیے۔ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اُس کا کوئی حق مسلّم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کو رائج اور نافذ کرنے کے لئے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجامدہی میں قاصر ہے تو تمہارا یہ حق ہی نہیں بلکہ فریضہ ہے کہ تم ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔"

(C.F. INTERPRETERS OF MAN)

قرآن کریم حکومت کو قوانینِ خداوندی کے نافذ اور مستقل اقدار کے رائج کرنے کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ اس کا واضح ارشاد ہے کہ:- وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (۵/۴۴) "جو خدا کے نازل کردہ قوانین کے مطابق حکومت نہیں کرتے تو یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔" البتہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، ان قوانین کی جزئیات مرتب کرنے اور ان کے نفاذ کے لئے اسباب و ذرائع اختیار کرنے کا کام نمائندگانِ ملت کے باہمی مشورہ سے ہوگا۔ اس حد تک یہ حکومت جمہوری ہوگی۔

یوں تو مادی نظریۂ حیات نے زندگی کے ہر شعبہ میں فساد پیدا کیا ہے، لیکن معاشی گوشہ میں اس کی تباہیاں بڑی انسانیت سوز ثابت ہوئی ہیں۔ عیسائیت کے اس عقیدہ نے کہ غریبوں کی بادشاہت آسمان میں ہے زمین پر نہیں، رزق کے تمام سرچشموں کو بے محابا "دنیا داروں" کے سپرد کر دیا۔ اس سے وہاں کے نظامِ سرمایہ داری کو بڑی تقویت ملی۔ اس کا ردِ عمل کمیونزم کی شکل میں رُونما ہوا۔ کمیونزم میں ایک چیز ہے اس کا معاشی نظام (ECONOMIC ORDER) اور دوسری چیز ہے وہ فلسفۂ زندگی جس پر اس معاشی نظام کی عمارت استوار ہے۔ اس کے معاشی نظام کے بعض اجزاء قرآن کے معاشی نظام سے ملتے جلتے ہیں (قرآن نظامِ سرمایہ داری کا شدید دشمن ہے) لیکن اس کا فلسفۂ زندگی جو مادی تصورِ حیات کی شدید ترین شکل کا مظہر ہے، قرآنی تصورِ زندگی کی نقیض ہے۔ اس لئے اسلام کے نزدیک یکسر ناقابلِ قبول۔ کمیونزم کا بنیادی اصول یہ ہے کہ "جو کچھ معاشی نقطۂ نگاہ سے اچھا ہے، وہی اخلاقی نقطۂ نگاہ سے اچھا ہے" (WHAT IS ECONOMICALLY GOOD IS MORALLY GOOD) کمیونزم کے معاشی نظام کی بنیاد اس نظریہ پر ہے کہ ہر شخص زیادہ سے زیادہ محنت کرے اور اس میں سے صرف اپنی ضروریات کے مطابق لے۔ قرآن کا بھی یہی نظریہ ہے۔ لیکن کمیونزم کے فلسفہ کی رُو سے اس سوال کا جواب کسی کو نہیں مل سکتا کہ ایک شخص زیادہ سے زیادہ کما کر کم از کم اپنے لئے کیوں رکھے، اور باقی سب کچھ دوسروں کو کیوں دیدے؟ اس کا اطمینان بخش جواب صرف قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے مل سکتا ہے۔ اس تصور کی رُو سے جس طرح انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے کوئی فرد خود استعمال کرے۔ اس کی ذات کی نشوونما (DEVELOPMENT OF PERSONALITY) اس سے ہوتی ہے جسے وہ دوسروں کی پرورش کے لئے دے۔ اور چونکہ ذات کی نشوونما بلند ترین مقصدِ زندگی ہے، اس لئے اس تصور پر ایمان رکھنے والا انسان کوشش کریگا کہ وہ زیادہ سے زیادہ کمائے اور پھر زیادہ سے زیادہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دیدے۔ یوں وہ مقصد جو کمیونزم آہنی پردوں کے پیچھے استبداد کے ڈنڈے سے حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتی ہے، قرآنی نظام میں از خود بطیبِ خاطر حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔ پروفیسر (HAWTREY) نے لکھا ہے:-

"جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے، یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جس سے وہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے"

کمیونزم کا مادی نظریۂ حیات اس مقصد کے لئے کوئی جذبۂ محرکہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس قرآنی نظریۂ حیات ایسا مستحکم جذبۂ محرکہ عطا کرتا ہے جو کبھی ٹھنڈا نہیں پڑ سکتا (جو احباب اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ میری کتاب "نظامِ ربوبیت" یا "سلیم کے نام خطوط" یا انگریزی پمفلٹ (QURANIC ECONOMIC ORDER) کا مطالعہ فرمائیں)۔ مغرب نے اپنے نظامِ سرمایہ داری کو بھی آزما کر دیکھ لیا، اور کمیونزم کی تباہکاریاں بھی دنیا کے سامنے آگئیں۔ اب دنیا کو ایک ایسے معاشی نظام کی تلاش ہے جس میں نہ نظامِ سرمایہ داری باقی رہے اور نہ کمیونزم۔ اور جس سے روٹی کا

معاشی نظام

مسئلہ فرد کی انفرادیت کو باقی رکھتے ہوئے حل ہو جائے۔ یہ نظام قرآن کے علاوہ اور کہیں نہیں۔

برادرانِ عزیز! آپ نے دیکھ لیا کہ مغرب نے جو تصورِ حیات اختیار کیا تھا۔ اس کے تباہ کن نتائج سے وہ کس قدر ہراساں و پریشان ہے۔ اور اب کس طرح کسی جدید نظام کی تلاش میں مضطرب سرگرداں۔ یہ نظام اُسے قرآن کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ قرآن کا نام لینے والی قومیں زندگی کی دوڑ میں اقوامِ مغرب سے بھی پیچھے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ آگے بڑھنے والی قومیں کبھی ان اقدار کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا کرتیں جو خود اُن کی دست نگر ہوں۔ مسلمانوں کے لئے خود عزت کا مقام حاصل کرنے اور دنیا کو موجودہ جہنم سے نجات دلانے کا ایک ہی طریقہ ہے، اور وہ یہ کہ کسی ایک خطۂ زمین میں قرآنی نظام کو عملاً رائج کر کے اُس کے انسانیت ساز نتائج سامنے لائے جائیں۔ ان نتائج کو دیکھ کر دنیا خود بخود اس کی طرف لپک کر آئے گی، اور اس طرح جنت سے نکلا ہوا آدم، اپنے فردوسِ گم گشتہ کو پھر سے پا لیگا۔

میری آرزو یہ ہے کہ یہ خطۂ پاکستان کی سرزمین ہو۔ یہی طلوعِ اسلام کی تحریک کا مقصد ہے۔ وَ اٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ؏

اس بصیرت افروز اور اہم مقالہ میں

جن شہرۂ آفاق مفکرینِ مغرب کی فکری و نظری کاوشوں کے اقتباسات شامل ہیں اُن کی پوری تفصیل

پرویز صاحب کی اہم کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملیگی۔

اس کتاب میں افلاطون سے لیکر عصرِ حاضر کے چوٹی کے مفکرین و مستشرقین تک کی عظیم تصانیف سے اس تاریخی حقیقت کو نظرِ عام پر لایا گیا ہے کہ وحی کی روشنی سے انحراف اختیار کر کے عقلِ انسانی نوعِ انسانی کو محض حیوانی کس مقام تک پہنچا سکی

عصرِ حاضر کی یہ بے مثال تصنیف

(بقول اخبارات) ہزاروں کتابوں کا نچوڑ ہے

ملنے کا پتہ:- میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

بزمِ خواتین

۸ اپریل کی شام کے خصوصی اجلاس کی تقاریر

تعارف کے لئے دیکھئے روئیداد کنونشن

★ ڈاکٹر زاہدہ درّانی
★ پروفیسر شمیم انور
★ پروفیسر زاہدہ منظور
★ محترمہ ثریا عندلیب
★ محترمہ سکندرہ ریاض
★ پروفیسر سعیدہ اختر
★ پروفیسر حمید جہاں خواجہ

ڈاکٹر کی مشکلات

ڈاکٹر زاھدہ کاردار (ایم - بی - بی - ایس) ۱۱ فاضلیہ کالونی - فیروز پور روڈ - لاہور

صدرِ محترم - میری بہنو، بھائیو اور بزرگو!

میری اس مختصر سی تقریر کا موضوع ہے "ڈاکٹر کی مشکلات"۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر کی زندگی کے دونوں حصے سامنے آجائیں گے۔ ایک حصہ وہ جس میں وہ ابھی ڈاکٹر بن رہا ہوتا ہے۔ یعنی اُس کی طالب علمی کا زمانہ۔ اور دوسرا حصہ وہ جس میں وہ ڈاکٹری کرتا ہے۔ جہاں تک اُس کی طالب علمی کے زمانے کا تعلق ہے، وہ پہلے سائنس کا سٹوڈنٹ ہوتا ہے، اور اس کے بعد میڈیکل کالج میں آجاتا ہے۔ اگرچہ اس کی سائنس کی تعلیم ابتدائی ہوتی ہے، لیکن اُس کا سارا تعلق طبیعاتی دنیا (PHYSICAL WORLD) سے ہوتا ہے۔ میڈیکل کالج میں انسان کے جسم کی مشینری، اس کی بیماریوں اور بیماریوں کے علاج کی تعلیم دی جاتی ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اس قسم کی تعلیم کا انسان کے معتقدات اور اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، لیکن حقیقت یہ نہیں۔ یہ تعلیم طالب علم کے دل اور دماغ کو غیر شعوری طور پر متاثر کئے جاتی ہے۔ اور رفتہ رفتہ اُسے اور ہی سانچے میں ڈھال دیتی ہے۔ اُسے انسان کا سینہ چیر کر دکھا دیا جاتا ہے کہ اس میں دل ہے، پھیپھڑے ہیں، جگر ہے، گردے ہیں۔ گوشت، پوست، لہو اور ہڈیاں ہیں۔ اور ان کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جسم کی حرارت سے خون میں گردش پیدا ہوتی ہے، اور اسی سے یہ زندہ رہتا ہے۔ جب یہ حرارت اور حرکت ختم ہو جاتی ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ پھر مُردے کو چیر پھاڑ کر دکھایا جاتا ہے کہ اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو زندہ انسان میں تھا، اور چند دنوں کے بعد یہ گل سڑ جائے گا۔ پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ کچھ انسان ہی سے مخصوص نہیں، تمام حیوانات کی یہی حالت ہے۔ اس سے طالب علم کے دل میں آہستہ آہستہ، یہ خیال جاگزیں ہو جاتا ہے کہ انسان، حیوان ہی کی بڑھی ہوئی شکل ہے۔ اس کا جسم، طبیعاتی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے، اور انہی کے مطابق اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ جب موت سے اس کا جسم گل سڑ جاتا ہے تو انسان کا بھی خاتمہ ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب انسانی زندگی کے متعلق یہ نظریہ قائم ہو جائے تو پھر زندگی کا مقصد جسم کی پرورش اور آسائش کے علاوہ کچھ نہیں رہتا۔ نہ انسان کے سامنے کوئی بلند اقدار رہتی ہیں۔ نہ عقل سے ماورا کسی اور راہ نمائی کی ضرورت کا احساس۔ نہ قانونِ مکافاتِ عمل کا تصور سامنے آتا ہے، نہ موت کے بعد زندگی کا خیال۔ نتیجہ اس کا یہ کہ جب طالب علم کالج سے باہر آتا ہے۔ تو وہ مغرب کے مادّی نظریۂ حیات میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

میری تعلیم، لڑکیوں کے میڈیکل کالج میں ہوئی تھی۔ اس میں اکثر لڑکیاں ایسی بھی ہوتی تھیں جن کے گھر کا ماحول بالا - ابتدائی

تعلیم مذہبی ہوتی تھی۔ جب کالج کی تعلیم اور ان کی مذہبی تعلیم و تربیت میں ٹکراؤ ہوتا تو وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتے۔ اُن کی مذہبی تعلیم، سائنس کے پیدا کردہ اعتراضات کا مقابلہ کرنے کے لئے ناکافی ہوتی۔ نتیجہ یہ کہ اُن میں سے کچھ تو مذہب سے برگشتہ ہو کر، خالص مادیت کے آغوش میں چلی جاتیں۔ جو اس کا مقابلہ کرتیں وہ دونوں میں مفاہمت (COMPRO-MISE) کی یہ صورت پیدا کرتیں کہ سائنس کا دائرہ الگ ہے اور مذہب کا الگ۔ اس کے بعد ان لڑکیوں (یعنی ان لیڈی ڈاکٹرس) کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ یہ اپنے مذہبی جذبہ کی تسکین، ورد وظائف اور نذر نیاز سے کر لیتی ہیں، اور ڈاکٹری کاروبار میں ان کا نقطۂ نظر خالص مادیت کا ہوتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جس تعلیم کے متعلق عام اندازہ یہ ہے کہ اس کا انسان کی مذہبی دنیا سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا، وہ کس طرح طالب علموں کے بنیادی تصورات تک کو بدل دیتی ہے۔ یہ ہے پہلی دشواری۔ دوسری دشواری اُس وقت پیدا ہوتی ہے، جب ڈاکٹر پریکٹس شروع کرتے ہیں۔ یہ دشواری انھیں پیش آتی ہے جو انسانی ہمدردی کا جذبہ دل میں لئے ہوئے آتے ہیں۔ ہمارے ملک کی نوّے فیصد سے بھی زیادہ آبادی مختلف امراض کا شکار ہوتی ہے۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہوتے ہیں، جن کے ہاں نہ پیٹ بھر کر کھانے کو ہوتا ہے نہ سردی گرمی سے بچنے کا کافی سامان۔ تنگ و تاریک کوٹھڑیاں، جن میں نہ تازہ ہوا کا گذر نہ دھوپ کا۔ غلاظت سے بھرا ہوا ماحول، گندی فضا، ناقص غذا۔ یہ جیتے جاگتے انسان نہیں، بلکہ چلتے پھرتے ہڈیوں کے ڈھانچے ہوتے ہیں۔ ان میں عورتوں اور بچوں کی حالت اور بھی قابلِ رحم ہوتی ہے۔ سرِدست ہمارے ہاں سرکاری ہسپتال اتنے زیادہ نہیں، جو ملک کی پوری آبادی کے لئے کافی ہو سکیں۔ اس لئے ان بیماروں کو پرائیویٹ ڈاکٹروں کے پاس جانا پڑتا ہے۔ اب سوچئے کہ جس ڈاکٹر کے سینے میں حساس دل ہو، ان بیماروں کا علاج کرتے وقت اُس پر کیا گذرتی ہوگی؟ اگر وہ ان سے پیسے لیتا ہے تو اس کا دل کانپ اُٹھتا ہے۔ اور اگر نہیں لیتا تو بھوکا مرتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسان ایک دو دن کے لئے تو بھوکا رہ سکتا ہے، مستقل طور پر ایسا نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اُس کی زندگی ایک مستقل کشمکش بن جاتی ہے۔ اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ میں ابھی نہیں کہہ سکتی۔ اس لئے کہ میں اس وادی میں ہنوز نو وارد ہوں۔

جہاں تک طالب علمی کے زمانہ کی دشواری کا تعلق ہے، میں اس کے متعلق پچھلے سال تک تو کچھ نہیں کہہ سکتی تھی لیکن سالِ گذشتہ میں نے جو قرآنی تعلیم "باباجی" سے حاصل کی ہے، اُس کی بنا پر یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ اگر ہمارے کالجوں میں زیادہ نہیں تو "سلیم کے نام خطوط" اور "انسان نے کیا سوچا؟" جیسی کتابیں بطور نصاب رکھ دی جائیں، تو ان کالجوں سے جو طالب علم باہر آئیں وہ بیک وقت اچھے ڈاکٹر اور بلند پایہ انسان ہوں جن کے سامنے زندگی کی مستقل اقدار اور اُن کی صداقت پر علیٰ وجہ البصیرت ایمان ہو۔

دوسری مشکل کا حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ عوام کی صحت اور ڈاکٹروں کی ضروریاتِ زندگی، دونوں کی ذمہ داری

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

عورت کی مظلومی کے اسباب

پروفیسر شمیم انور (ایم۔ اے) کنیئرڈ کالج۔ لاہور

[اصل تقریر انگریزی میں تھی۔ اس کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے۔ اصل تقریر بطور ضمیمہ شامل ہے]

آج شام خواتین و حضرات! میں چاہتی ہوں کہ عورت کی زندگی سے متعلق چند ٹھوس، لیکن تلخ حقائق پر اپنی بصیرت کے مطابق روشنی ڈالنے کی کوشش کروں۔ عورت کی محکومی اور مظلومی کی داستان طویل ہے۔ اس پر بہت کچھ لکھا بھی جا چکا ہے۔ اور اب تو زمانہ اس حقیقت کو بھی قبول کر چکا ہے کہ عورت کی مضمر صلاحیتوں کو کھلی فضا میں کبھی پنپنے کا موقعہ ہی نہیں ملا۔ آج وہ نسوانیت کی مسخ شدہ شکل ہے ——— اپنے وجود کا دھندلا سا نامکمل خاکہ ——— مجھے ہمیشہ وقت کے اس موڑ کی تلاش رہی ہے۔ جہاں پہنچ کر کاروانِ نسائیت اس طرح دو حصوں میں بٹ گیا۔

عورت نے کب، کیوں اور کیسے اپنا مقام کھو دیا؟ وہ کونسے اسباب تھے جنھوں نے عورت سے اس کی شخصیت کی نشوونما کے تمام ذرائع چھین لئے اور اسے زندگی کی حیوانی سطح پر لا کھڑا کیا؟ عورت آج تک ان حدبندیوں سے آزاد کیوں نہ ہو سکی؟ انہی سوالات نے مجھے ہمیشہ پریشان رکھا ہے۔ اور آج معزز خواتین و حضرات! انہی سوالوں کے حل ——— جو میں نے ذاتی مشاہدے اور مطالعے کی مدد سے ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی ہے ——— آپ کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کروں گی۔

قدرت نے نسلِ انسانی کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے کا اہم فریضہ عورت کو سونپ رکھا ہے۔ اسی حیاتیاتی فریضہ (BIOLOGICAL FUNCTION) کی سرانجام دہی عورت کو کچھ عرصہ کے لئے عملی کاموں سے معذور کر دیتی ہے۔ اس معذوری کے زمانے میں زندگی کے طبعی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اسے کسی ایسے سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جو عملی دنیا میں بھی اس کی طرح بے بس ہو کر نہ رہ جائے۔ فطرت کے تقاضے میں یہ سہارا مرد ہے۔ لاچاری کے دنوں میں تمام تر ضروریاتِ زندگی کے لیے عورت کو مرد کا رہینِ منت ہونا پڑتا ہے۔ اور حیوانی سطحِ زندگی کا اصول ہے کہ محتاج کو بے بس سمجھ کر اس کی زیردستی سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے اور اس کے حقوق کو جہاں تک ہو سکے پامال کیا جائے۔ عورت کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ لیکن وہ تحفظِ خویش (SELF PRESERVATION) اور اس سے زیادہ تحفظِ اولاد کی خاطر یہ سب کچھ برداشت کرتی رہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرد اور عورت کے درمیان حاکم و محکوم کا یہ رشتہ پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ اور زندگی کی اس مکروہ شکل کو جائز اور عین فطرت کے مطابق سمجھا جانے

انکار — طبع انسانی کی افتاد کچھ ایسی ہی واقع ہوئی ہے کہ اگر اکثریت کسی عمل کو کچھ عرصہ تک دُھراتی رہے تو اس عمل کے جواز کے لئے کسی اور دلیل کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ اور اس کی مخالفت کو فطرت کی مخالفت سمجھا جانے لگتا ہے۔

تصریحاتِ بالا سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ عورت کی محکومی اور مظلومی کی ایک وجہ اس کی معاشی معذوریاں ہیں زیادہ وضاحت کیلئے قبائلی طرزِ زندگی کی دو بنیادی شکلوں — (MATRIARCHAL & PATRIARCHAL) کا مطالعہ مفید ثابت ہوگا — یعنی وہ معاشرہ جس میں مرد بزرگِ خاندان ہوتا تھا اور وہ جس میں عورت کو یہ منصب حاصل ہوتا تھا۔

ایسی مثالیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں جب واقعی تندرست و توانا عورتوں نے حمل کے ایام میں بھی معذور ہو کر گھر بیٹھنے کے بجائے اکتسابِ رزق میں مردوں کا ساتھ دیا ہے۔ اور بچّے کی پیدائش کو عملی کاموں کی سرانجام دہی پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

دنیا کے ایسے حصّوں میں بھی جہاں حصولِ معاش کے لئے زیادہ جدوجہد کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ عورتوں نے میدانِ عمل میں مردوں کے ساتھ برابر کا حصّہ لیا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسانی معاشرت کی تاریخ میں (MATRIARCHAL) "مادری نظامِ زندگی" اسی قسم کے ماحول کی پیداوار ہے۔ اور (PATRIARCHAL) "پدری نظامِ زندگی" ان اسباب کی عدم موجودگی کا مظہر ہے۔

آج (PATRIARCHAL) "پدری نظامِ زندگی" دنیا کے زیادہ تر حصّوں میں مقبول ہے۔ لیکن (MATRIARCHAL) "مادری نظامِ زندگی" کی ایک دو مثالیں بھی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اگر عورت کی معاشی معذوریوں کو دور کر دیا جائے تو اس کی شخصیت کی نشو و نما کے امکانات ایک بار پھر تازہ ہو جائیں اور وہ اپنے کھوئے ہوئے مقام کو پھر پا جائے۔

دنیا میں ظلم و استبداد۔ خود غرضی و مفاد پرستی کا ہاتھ عورت ہی کی رگِ جان تک پہنچا ہے۔ حیوانی سطح کی زندگی، تمام انسانوں کو بڑے چھوٹے دائروں میں تقسیم کر دیا کرتی ہے۔ جس میں ہر دائرہ اپنے تحفّظ کے لئے اپنے سے چھوٹے دائرے کو نگلتا رہتا ہے۔ اسی اصول کے تحت زمیندار نے کاشتکار کو اپنا محکوم بنایا۔ سرمایہ دار نے مزدور کی بے بسی سے فائدہ اٹھایا۔ صاحبِ زر اقوام نے غریب اقوام کو تختۂ مشق بنایا۔ مالک نے نوکر پر اور افسر نے ماتحت پر رعب جمایا اور مرد نے عورتوں کو غلام بنایا۔ ملوکیت نے بھی اپنے تحفّظ کی خاطر ضروریاتِ زندگی کو اتنے فاصلے پر رکھا جہاں تک پہنچنے کے لئے عام افراد کو اپنے پسینے کا آخری قطرہ تک بہا دینا پڑے۔ (یہ امر دلچسپ ہے کہ حصولِ معاش کے سلسلہ میں امیر و غریب، حاکم و محکوم کی جماعتی تفریق کے ساتھ ساتھ — معاشی اصطلاح میں — عورت بھی ایک طبقہ قرار پا گئی۔)

حکومت کا نشہ، افیون کے نشہ سے کم نہیں ہوا کرتا۔ وہ اختیار و تسلط جو حاکم کو محکوم پر، طاقت ور کو کمزور پر، مرد کو عورت پر کچھ عرصہ کے لئے حاصل ہوا ہو، آسانی سے ہٹایا نہیں جا سکتا۔ اسے قائم رکھنے کیلئے جواز کی راہیں تلاش کی جاتی ہیں۔ انسانوں کے خود ساختہ مذاہب اس مشکل کو بھی حل کر دیتے ہیں۔ مذہبی رہنماؤں نے یقین دلایا کہ حاکم وقت کے احکام کی تعمیل خدا کے احکام کی تعمیل ہے۔ عورت کو فتنہ قرار دیا۔ اور کہا کہ آدم کو باغِ بہشت سے نکلوانے کی ذمہ دار وہی ہے۔ اور چونکہ وہ آدم کی پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی ٹیڑھی ہوتی ہے اس لئے اس کی اصلاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس قسم کے مذہب کی اس تائید نے عورت کی رہی سہی شخصیت کو پامال کر دیا اور محکومی و مظلومی کو تقدیس کا رنگ دیکر اس کی طرف سے احتجاج کے ہر امکان کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔ ادب کی دنیا بھی نسوانیت کی اس زخم خوردہ شکل کو اپنائے بغیر نہ رہ سکی وہ نئی نئی مثالوں اور تازہ محاوروں کی مدد سے اس کے نقوش کو عوام کے ذہنوں میں گہرا کرتی چلی گئی۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کو بلا جھجک (INTELLECTUAL MONSTROSITIES) "ذہین بلا" کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ عورت کو ناقص العقل کہا جاتا ہے، اور اسی کم عقلی کو اس کے حسن و جاذبیت کا جزو قرار دیا جاتا ہے۔ اسے ناقابلِ اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ شیکسپیئر نے کہہ دیا ("FRAILTY — THY NAME IS WOMAN") لغزش کا دوسرا نام عورت ہے۔

یہ نظریات خود عورت کے شعور کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ مرد کا پیدا کیا ہوا احساسِ کمتری آہستہ آہستہ یقین کی صورت اختیار کر گیا۔ اپنی بیچارگی کو اس نے فطرت کا اٹل قانون سمجھنا شروع کر دیا۔ اور آج یہی کہنہ یقین اپنے حصولِ آزادیٔ فکر و عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بن چکا ہے۔

خواتین و حضرات! عورت کی مجبوریوں کی داستان یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ معاشی آزادی ہی اس کے تمام مسائل کا حل نہیں۔ وہ اگر یہ ثابت بھی کر دے کہ میدانِ عمل میں وہ مرد سے کسی طرح کمتر نہیں۔ پھر بھی وہ "عورت" ہی رہیگی۔

تہذیب و تمدن کی وہ عمارت، جو انسان نے خود اپنی وضع کی ہوئی اقدار پر اٹھائی، اپنے ساتھ بہت سی نفسیاتی الجھنوں کو بھی لئے ہوئے تھی۔ ان میں سے ایک جنسیات کے متعلق غیر فطری نظریات کا بتدریج وجود میں آنا تھا۔

ان نظریات کی ابتدا، دراصل خدا کے متعلق لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ کے قدیمی تصور سے ہوئی۔ تقدس کے اس تصور سے متاثر ہو کر انسانوں نے جنسی معاملات اور تعلقات کو گناہ کے مترادف سمجھنا شروع کر دیا عیسائیت کی موجودہ شکل نے اس اندازِ فکر کو اور ہوا دی۔ کنواری مریمؑ کے تصورات نے حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کو کسی قسم کے جنسی تعلق سے مبرا قرار دیدیا۔ پھر خود حضرت عیسیٰؑ کی مجرد زندگی نے زہد و تقدس کے اس خاص رنگ کو اور گہرا کر دیا۔ موجودہ انجیل کے مطابق وہ گناہ، جس کی بدولت آدمؑ اور حوّاؑ کو باغِ بہشت سے حکم سزا ملا تھا جنسی

تعلق بھی تھا۔ اور یہ آدمؑ اور حوّاؑ کی ذات پر ہی ختم نہیں ہو گیا، بلکہ ہر انسانی بچے میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ اور اس کا واحد کفارہ اور ازالہ حضرت عیسیٰؑ کی "پاکدامنی" پر ایمان ہے۔

حوّاؑ کا قصور بھی شاید آدمؑ کی بیٹیوں میں منتقل ہوتا چلا آیا ہے۔ کیونکہ عیسائیت نے عورت کو فتنہ سمجھ کر اس سے دُور رہنے کی تلقین کی ہے۔ عورت نے ازل سے مرد کو بہکایا ہے۔ وہ شاید مرد کے زہد و تقویٰ کی آزمائش کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ جو اس کے ہتھکنڈوں سے اپنے آپ کو بچائے رکھے وہی اپنی ذات کی تکمیل کر سکتا ہے۔

ماحول میں ان نظریات اور معتقدات کی موجودگی کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ عورت کو انسان نہیں، بلکہ مرد کی حیوانی خواہشات کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھا جانے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مرد کا طرزِ تخاطب عورت کے لئے وہی نہیں ہوتا جو اپنے ہی کسی ہم جنس کے لئے ہوتا ہے۔

عورت کی اس سے زیادہ توہین اور کیا ہو سکتی تھی خواتین و حضرات! کہ اُسے مستقل طور پر ایک ایسے تصوّر سے وابستہ کر دیا جائے جسے معاشرہ وجہِ ذلت و رسوائی قرار دے چکا ہو؟

اس لئے میں محسوس کرتی ہوں کہ جب تک جنسی میلانات کو ان گھناؤنے تصورات سے نجات نہیں دلائی جاتی جب تک جنسی تعلقات کو ان کا جائز مقام نہیں دیا جاتا۔ اُس وقت تک معاشرہ صحت مند نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی عورت کو سطحِ انسانیت پر لایا اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ مرد نے آج تک محض اُن ہی عورتوں کی عزت کی ہے جن سے کسی قسم کے جنسی تعلق کا تصوّر نہ ہو سکتا ہو ـــــ مثلاً اس کی ماں، بیٹیاں یا بہنیں۔

برادران! یہ ہیں زندگی کے وہ ٹھوس اور ناخوشگوار حقائق، جن کا ہمیں آج سامنا کرنا ہے۔ انہیں کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آج معاشرہ میں عورت کا عورت ہونا ہی اس کا سب سے بڑا جرم ہے۔ جس کا خمیازہ اُسے عمر بھر بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک شودر کے لئے تو یہ امید ہو سکتی ہے کہ وہ چونتیس کروڑ بار جنم لے کر کسی برہمن کے گھر پیدا ہو جائے لیکن عورت کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ان ذلت آمیز تصوّرات کے جال سے آزاد کرے جو معاشرے نے اس کے گرد بُن رکھا ہے۔

عورت کے ان مسائل کا حل صرف قرآنی نظامِ معاشرت میں مل سکتا ہے۔ دنیا میں یہی ایک نظام ہے جو ہر فرد کو اس کی ضروریاتِ زندگی بلا مزد و معاوضہ مہیا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ اور اس طرح روٹی کا نوالہ دیکر جان مول لے لینے والے معاوضہ پرستوں کے ہاتھ باندھ کر رکھ دیتا ہے۔ اس معاشرے میں ہر انسان کے طبعی تقاضے قانوناً پورے کئے جاتے ہیں۔ کسی سخی کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے جاتے ـــــ چنانچہ عورت کے لئے مستقبل میں اگر کوئی امید کی کرن نظر آ سکتی ہے تو وہ نظامِ ربوبیت ہی کے قیام و دوام میں نظر آ سکتی ہے۔ علاوہ ازیں، اسلام ہی وہ طرزِ زندگی ہے جو فرد کو توہمات کی تاریک دنیا سے نکال کر انسانیت کی سطح پر لا کھڑا کرتا ہے ـــــ اور اس

(بقیہ صفحہ ۱۰۶ پر)

آزادی

پروفیسر اهل کا منظور (ایم۔ اے) گورنمنٹ کالج فار وومنز لاہور

صدرِ محترم - معزز خواتین و حضرات!

سب سے پہلے، میں اس بزم کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں جس نے بے زبانوں کو زبان دی۔ عورتوں کو بے زبان کہہ کر، برادران! میں ان کے باتونی ہونے سے انکار نہیں کرتی۔ "بے زبان" سے یہاں میرا مطلب اس گھریلو یا پالتو قسم کے جانور سے ہے۔ جو آپ سے یہ نہ پوچھ سکے کہ آپ نے اسے ایک کھونٹے سے کھول کر دوسرے کھونٹے سے کیوں باندھ دیا جو خود اپنے لئے فیصلے کرنے سے قاصر ہو، یا قاصر بنا دیا گیا ہو۔ وہ جس کی روح پہ قید ہو، گفتار پہ تعزیریں ہوں، جس کی فکر محبوس ہو اور جذبات پہ زنجیریں ہوں۔

عورت کی بے زبانی، برادرانِ عزیز! اُس بے زبان کی بے زبانی سے زیادہ قابلِ رحم رہی ہے جسے سپوتنک (SPUTNIK) میں بند کر کے فضا کی پہنائیوں میں بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا ہو۔ اُس بے زبان پہ خود مختاری کی تہمت نہیں۔ لیکن عورت پہ انسان ہونے کی جہت سے خود مختاری کی تہمت بھی ہے۔

برادرانِ عزیز! اقوامِ متحدہ کے اجلاس میں بیگم اکرام اللہ کا کھڑے ہو کر کشمیر کے مسئلہ پہ دھواں دار تقریر کرنا تو اہلِ وطن کی سمجھ میں آ سکتا تھا، لیکن ایک عورت کا کسی ایسی مجلس میں برسرِ منبر آنا جس میں خدا اور اس کی کتاب کا ذکر آتا ہو، اسی قدر ناقابلِ تصور سمجھا جا رہا ہے، جس قدر ایک مرد کا ایک ہی وقت میں دو یا تین بیویاں نہ رکھ سکنا۔ ایسا کیونکر ہوا برادران؟ مذہب کی مچان لگا کر عورت کا شکار کیسے کھیلا گیا؟ یہ ابھی ابھی میری ایک بہن واضح کر چکی ہیں۔

آج تک تو کام بہت آسان تھا، برادرانِ عزیز! نہ فکرِ جہاں، نہ غمِ دوران — خود اپنے لئے بھی فیصلے کرنے کی زحمت کبھی نہ اٹھانی پڑی تھی۔ قفس کے گوشے کی عافیت اب بھی کبھی یاد آتی ہے تو عافیت پسند ذہن بے ساختہ پکار اٹھتا ہے

زندگی یوں بھی گذر ہی جاتی

کیوں ترا راہ گذر یاد آیا

"راہ گذر" کا یاد آنا، برادرانِ عزیز! تحریکِ طلوعِ اسلام میں قدم رکھنا تھا۔ شروع شروع میں جذبۂ محرکہ — اگر آپ اسے حرکت کہہ سکتے ہیں — بڑوں کے حکم کے تحت "خدا اور رسول" کا نام سُن کر "عاقبت سنوارنا" تھا۔ پھر آہستہ آہستہ برسوں کے بسائے ہوئے صنم خانے ویران ہونے لگے۔ بات سمجھ میں آنے لگی۔ اور آخر کار، دستورِ زبان بندی

بھی تنگ ہوگیا۔ کچھ کہنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ انسانوں کے خودساختہ قفس کی چلمن کی رنگین تیلیاں ایک ایک کرکے ٹوٹ چکی تھیں۔ خدا کی عطا کردہ لذتِ پرواز پھر ایک مرتبہ بیدار ہو چکی تھی۔ لیکن ساتھ ہی دیکھا تو ـــــ تیر بھی کمان میں تھا اور صیاد بھی کمیں میں ـــ میرا اشارہ، خواتین وحضرات! ان لامحدود ذمہ داریوں کی جانب ہے جو انسانیت کے مقام پہ پہنچ کر آدمی پر عائد ہوتی ہیں۔ اس درد جگر کی طرف ہے، جو مقامِ بندگی پہ پہنچ کر آدم کے حصّے میں آتا ہے۔ ایک روسی مصنّف کا کہنا ہے

"زندگی کے متعلق سوچنا خود زندگی سے کم دشوار نہیں"

لیکن برادران! مقامِ بندگی پہ پہنچ کر یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ یہی دشواریاں دراصل متاعِ حیات ہیں۔ جیسا کہ شاعرِ مشرق نے کہا ہے:-

متاع بے بہا ہے درد و سوزِ آرزو مندی
مقامِ بندگی دیکر نہ لوں شانِ خداوندی

یہ دشواریاں انسان کی آزادیٔ فکر و عمل کی پیدا کی ہوئی ہیں ـــ اور وہ شے جس نے صحیح ازل مقامِ آدم کو مقامِ فرشتہ سے افضل قرار دیا تھا۔ آزادیٔ فکر و عمل ہی تو تھی۔

یہاں پہنچ کر یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ آزادی کے مفہوم کو ذرا وضاحت سے بیان کردوں۔ جہاں تک عورت کا تعلق ہے "آزادی" چند سطحی تبدیلیوں کا نام رکھ دیا گیا ہے۔ مغرب کی عورت کو آزاد کہا جاتا ہے محض اس لئے کہ وہ نوکری کر سکتی ہے، نیم عریاں لباس پہن سکتی ہے اور مردوں کے ساتھ رقص کر سکتی ہے۔ ایسا معاشرہ خواتین وحضرات! جو عورت کو اس بات پہ مجبور کردے کہ وہ زندگی بھر مردوں کے معیارِ حسن و دلفریبی پہ پورا اترنے کی کوشش کرتی رہے آزاد معاشرہ نہیں۔ ایک انسان کا محض دوسرے انسان کی خوشنودی کی خاطر اپنی شخصیت کو تحلیل کر دینا، برادران! آزادی نہیں، آزادی کی تضحیک ہے۔ (LADIES FIRST) کے اصول کی ابتدا عورت کے مقام کو اونچا نہیں بلکہ نیچا ثابت کرنے کے لئے ہوئی تھی۔ یہ اخلاق نہیں، بلکہ جذبہ رحم کا اظہار تھا۔ اور ان دونوں میں بہت فرق ہے۔

میں اپنے وطن کی ان مغرب زدہ خواتین کو بھی آزاد ماننے کیلئے تیار نہیں، جو معاشرہ کے ہر قسم کے قیود و ضوابط سے آزاد ہو چکی ہیں۔ درحقیقت یہ بھی بے زبان، گھریلو اور پالتو قسم کے جانور ہیں ـــ رسیاں تڑا کر بھاگے ہوئے بے زبان گھریلو اور پالتو جانور ـــ ان کا رسیاں تڑانا، ان کے شعور کی بیداری کی دلیل نہیں ـــ یہ محض ردِ عمل ہے عورت کے اس بے جان تصور کے خلاف، جسے معاشرے نے اپنایا اور جسے مصورِ غم علامہ راشد الخیری نے اپنی کتابوں میں پیش کیا۔ اور ردِ عمل، برادران! کسی غور و فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی یہ کسی قسم کے تعمیری نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ لیکن مستقل اقدار کی غیر موجودگی میں اسے روکا بھی نہیں جا سکتا۔

آزادی، خواتین و حضرات! ایک قسم کی وضع قطع چھوڑ کر دوسری قسم کی وضع قطع اختیار کر لینے کا بھی نام نہیں۔ آزادی قلب و دماغ کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔ جناح نے انگریزی ٹوپی پہن کر انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی، اور مولانا ابوالکلام آزاد نے شرعی وضع قطع میں اپنے ضمیر اور اپنی قوم کو بیچ کھایا۔

برادران! خلیل جبران کی نظموں کا مطالعہ۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس میں دلچسپی۔ فرائیڈ کے نظریہ جنسیات پر بحث و تمحیص کسی کو بہت پسند ہو تو کہلوا سکتی ہے لیکن اس کی آزادی کی دلیل نہیں بن سکتی۔ آزادی برادران! رسیاں تڑا کر بھاگ جانے کا نام نہیں۔ آزادی کھونٹے اور رسی کی مدد کے بغیر اپنے مقام کو پہچان سکنے اور اس سے وابستہ رہنے کی صلاحیت کا نام ہے۔

خواتین و حضرات! یہ نفسیات کا اصول ہے کہ اگر کسی شخص کے کان میں بار بار یہ دہرایا جائے کہ تم پاگل ہو، تم سودائی ہو تو ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب وہ واقعی اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور اپنے آپ کو پاگل اور سودائی سمجھنے لگتا ہے۔ اس سے پاگلوں اور سودائیوں کی سی حرکتیں بھی سرزد ہونے لگتی ہیں۔ اسی قسم کا مذاق کچھ عورت کے ساتھ کیا گیا۔ مسلسل اور بار بار اُسے رنگین کھلونا کہہ کر پکارا گیا۔ پھر وہ وقت آیا جب وہ واقعی اپنے آپ کو رنگین کھلونا سمجھنے لگی۔

اس سے برادران! شاید مردوں کے احساسِ ملکیت کی تو کچھ تسکین ہوگئی ہو لیکن انسانیت کے ارتقا کی راہیں اجاڑ کر رہ گئیں۔ وہ سکون جو عورت کی محکومی اور بے زبانی سے گھر میں حاصل ہو در اصل سکون نہیں، برادرانِ عزیز! جمود ہے۔

دور کیوں جائیے، اسی محفل سے متعلق ایک واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ غالباً دو سال ہوئے، انہی اجلاس میں ایک صاحب نے شرکت کی۔ واپس گھر پہنچے تو نظریوں کا اثر ابھی تازہ تھا۔ رفیقۂ حیات سے تبادلۂ خیالات کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پاس بیٹھ کر فرمانے لگے۔

"آج چوہدری صاحب نے اپنی زندگی کے بڑے عجیب و غریب واقعات سنائے۔ کہتے تھے ......"
بیوی نے ایک لمحہ کے لیے ان کی طرف دیکھا اور پھر بڑے اطمینان سے فرمایا۔ "آپ کی اس قمیص کا کپڑا بڑا اچھا رہا۔"
بیچارے کچھ جھینپ سے گئے۔ بہرحال سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "چوہدری صاحب نے کہا ......"
بیوی نے پھر نظریں اوپر کو اٹھائیں اور مسکرا کر کہا۔ "دو مرتبہ دھل چکی ہے لیکن اس کے رنگ میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا۔"
شوہر بھی آسانی سے ہار ماننے والے نہیں تھے۔ تیسری مرتبہ پھر ڈھٹائی سے بولے۔ "چوہدری صاحب فرماتے تھے ..."
بیوی نے پھر متبسم نگاہیں شوہر کی طرف اٹھائیں ......

برادرانِ عزیز! یہ کسی ناخواندہ خاتون کا ذکر نہیں۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں انہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ کہا

جائے گا۔ ان کی ذہانت کے چرچے اب تک ہیں ——— تو انھوں نے برادران! پھر متبسم نگاہیں شوہر کی طرف اٹھائیں اور کہا:۔ "دونوں مرتبہ میں نے اسے گھڑی میں دھو کر استری کیا ہے"۔ شوہر کی ہمت جواب دے گئی۔ پٹے ہوئے "جواریئے" کی طرح سر جھکائے باہر چلے گئے۔ اس وقت انہیں کون یہ بتاتا کہ

زخموں پہ دل کے آج یہ حیران ہوتا کیا
قبلہ یہ گل کھلائے ہوئے آپ ہی کے ہیں

یہی وہ بے زبان رنگین کھلونے، برادران! جو صرف اپنا ہی مقام نہیں کھو بیٹھے بلکہ آپ کو بھی آپ کی منزل سے دُور لئے جا رہے ہیں۔ یہ ہیں وہ بے حس پتھر جنھیں آپ ہی نے کناروں پر جمع کر کے اپنی وسعتوں کو محدود کر لیا ہے۔ ساحل کے وہ بے حس پتھر جن سے ہر آنے والی موج اپنا سر پھوڑ کر واپس لَوٹ جاتی ہے۔ یہ ہے وہ موت کا سکون جو زندگی کے ہر ولولے کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اور جسے بدقسمتی سے آپ حاصلِ زندگی سمجھے ہوئے ہیں۔

ان پتھروں کو، برادران! طوفانوں سے آشنا کر دیجئے۔ اس سکوت کو سوز و سازِ زندگی سے ہم آہنگ کر دیجئے۔ ان بے زبان رنگین کھلونوں کو ان کی شخصیت لوٹا دیجئے۔ ان کی آزادیٔ فکر و عمل لوٹا دیجئے۔ ان کا مقامِ بندگی لوٹا دیجئے موت دی ہے تو مسیحائی میں بھی ہاتھ بٹائیے۔ قرآن کی مستقل اقدار کی رُو سے یہ ان کا حق ہے، آپ کی نوازش نہ ہوگی۔

ختم کرنے سے پہلے میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ عورت کی محکومی کو مرد کی آزادی سمجھنا غلطی ہے۔ کرگسوں میں پلنے والے فریب خوردہ شاہین رہ و رسمِ شاہبازی سے واقف نہیں ہو سکتے۔ قرآن جب نوعِ آدم کو واجب التکریم بتاتا ہے، تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ نصفِ آدمیت کو قابلِ حقارت سمجھنا، باقی نصف کو واجب العزت نہیں بنا سکتا ——— ایک آنکھ دُکھتی ہو تو دُوسری آنکھ کبھی چین سے نہیں سو سکتی۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ خوش عقیدگی کی اسپرین سے، درد کا احساس تو کم ہو سکتا ہے، مرض نہیں جایا کرتا ——— اور اگر اس افیونی عمل کو ایک عرصہ تک جاری رکھا جائے تو وہ زخم ایک دن ناسور بن جاتا ہے ——— قرآن کے نسخے سے اس زخم کا علاج کیجئے، قبل اس کے کہ یہ زخم ناسور بن جائے۔ یاد رکھئے۔ عورت کی قرآنی آزادی، مرد کی حقیقی آزادی کی ضامن ہے۔ اس سے ڈریئے نہیں ——— والسلام۔

بقیہ "دھتکارے ہوئے انسان" صفحہ ۱۲ سے آگے

کہ آدم کو اس کی لغزش کے باوجود سرفراز کیا گیا تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ کسی کی لغزش پا اسے احترامِ آدمیت سے محروم نہیں کر دیتی۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے کھلے الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ میرے جو بندے اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھتے ہیں اُن سے کہہ دو کہ وہ میری رحمت سے مایوس نہ ہوں ——— لیکن جب معاشرہ کسی کو اس طرح دھتکار دے تو وہ مایوس کس طرح سے نہ ہو! قرآن کی رُو سے دھتکارا ہوا اور مایوس، ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ یعنی ابلیس، مدحور اور رجیم ہوتا ہے اور رجیم و مدحور ابلیس۔ یہ بنیادی تبدیلی قرآنی نظامِ عدل و تعزیر ہی سے ممکن ہے۔ اور اسی کیلئے میں معاشرہ کو یہ کہانیاں سُنانا چاہتا ہوں۔

معاشرہ میں عورت کا مقام

محترمہ ثریا عدیل لیئب ——— بیگم حبیب اللہ خان صاحبہ - میو گارڈن - لاہور

خواہران و برادرانِ عزیز! السلام علیکم۔

طلوعِ اسلام کے اس سالانہ کنونشن کے مبارک موقعہ پر ہم طاہرہ بہنوں اور بیٹیوں کو پہلی دفعہ اظہارِ خیال کرنے کی جو سعادت، ہمارے داعیِ انقلاب اور مفکرِ قرآن، جناب پرویز صاحب نے مرحمت فرمائی ہے، اس کے لئے ہم تہِ دل سے ان کی شکر گزار ہیں۔ ہمارے لئے یہ اس قدر سچی خوشی اور روحانی مسرت کا مقام ہے کہ جو محتاجِ بیان نہیں۔

اس قرآنی فضا میں جہاں قرآنی رشتے میں منسلک، ہم فکر و ہم خیال احباب اکٹھے ہوئے ہیں، وہاں ان سلیم بھائیوں کے ساتھ ساتھ طاہرہ بہنوں کا یہ پاکیزہ اجتماع، یقیناً ہمارے حال و مستقبل کو ایک پیامِ نو دے رہا ہے۔ ان گزرتے ہوئے لمحات کے ساتھ آنے والی ساعتیں ان شاء اللہ اس کی گواہی دیں گی۔

اس تقریبِ سعید پر جہاں اور بہت سے مسائلِ حیات پر قرآنی اصولوں کے ماتحت غور و فکر کیا جائے گا، وہاں قوم کی طاہرہ بیٹیوں پر یہ واضح ہو جانا بھی ضروری ہے کہ خالقِ حقیقی نے انھیں انسانیت کے کس درجے پر فائز کیا ہے اور انھیں کیسا مقامِ بلند عطا ہوا ہے۔ قرآن نے ان کے ذمہ کون سے فرائض عائد کئے ہیں، اور ان کو کیا حقوق دیئے ہیں، جن سے ان کو زندگی کی خوشگواریاں اور شادابیاں ملتی ہیں، اور اطمینان و سکون کی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں۔

سب سے پہلے ہر طاہرہ بیٹی کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کائنات میں عورت کا اپنا مقام ہے۔ اگر وہ اپنا مقام چھوڑ کر مرد کا مقام حاصل کرنے کی خواہاں ہے تو اُس کے لئے یہ امر باعثِ فخر نہیں۔ ہمارے اس دور میں، عورتوں کے دل میں، غیر شعوری طور پر، یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ دنیا میں عورت ہونا ذلیل ہونا ہے۔ یہ خیال، ایک ایسی نفسیاتی کشمکش میں ڈال دیتا ہے کہ جس کے نتیجہ میں عورت مرد بننے کے چاؤ میں، اپنا حقیقی و برتر مقام کھو دیتی ہے اور دوسری طرف سے اُسے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے مقام میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ مرد اور عورت ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں۔ اس لئے پیدائش کے اعتبار سے ان میں ایک کو دوسرے پر کوئی فضیلت نہیں۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَجَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا (۴/۱) "اللہ وہ ہے جس نے تم سب کو نفسِ واحد سے پیدا کیا اور ان سے اس کے جوڑے بنائے" دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے جزو ہیں۔ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ (۳/۱۹۴)، "تم سب (مرد و عورت) ایک دوسرے میں سے ہو" تقسیمِ عمل کے ضمن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بعض خصوصیات

مَردوں میں ایسی ہیں جو عورتوں میں نہیں اور بعض خصوصیات عورتوں میں ایسی ہیں جو مَردوں میں نہیں)۔ ان خصوصیات کے اعتبار سے مَردوں کو عورتوں پر، اور عورتوں کو مَردوں پر فضیلت حاصل ہے۔ فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (۴/۳۴) "اللہ نے (مَردوں اور عورتوں میں) ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے"۔

دراصل عورت کو مَرد کا زیرِ دست اُس وقت سمجھا گیا جب معاشرہ میں ذاتی ملکیت کا خیال پیدا ہوا، اور مَرد نے اپنے آپ کو پرائیویٹ پراپرٹی کا مالک بنا لیا۔ یوں اقتصادی طور پر عورت کو مَرد کا محتاج سمجھ لیا گیا۔ مگر قرآن نے مَرد کی اس بالادستی کو بھی اس فرمان کے ساتھ ختم کر دیا کہ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ (۴/۳۲) "مرد جو کچھ کمائیں وہ اُن کا حصّہ ہے، اور عورتیں جو کمائیں وہ ان کا حصّہ ہے"۔ اعمال کے لحاظ سے مرد و عورت میں کوئی تخصیص نہیں۔ ہر ایک اپنے عمل کا بدلہ پائے گا۔ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ (۳/۱۹۵) "تم سے کوئی، مرد ہو یا عورت، میں کسی کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا"۔ عیسائیت کے چور دروازوں سے داخل ہو کر یہ ایک عام عقیدہ مسلمانوں میں بھی مروّج ہے کہ جنّت میں اماں حوّا شیطان کے چکمے میں آ گئی تھیں، اور انھوں نے باوا آدم کو بہکایا۔ حالانکہ قرآن نے صاف الفاظ میں یہ کہا ہے کہ فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ یعنی شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا۔ چنانچہ قرآن کی اس وضاحت کے بعد یہ سمجھنا صریحاً غلط ہے کہ گناہ کی ابتدا عورت سے ہوئی ہے اور وہی مَرد کی لغزشوں کی ذمّہ دار ہے۔ برعکس اس کے لغزش کا امکان دونوں میں ہے اور ایک کی ذمّہ داری دوسرے پر عائد نہیں ہوتی۔ مرد و عورت کے باہمی تنازعہ میں دونوں کی حیثیت یکساں رکھی گئی ہے۔ سورۂ نور کی ابتدائی آیات اس کی وضاحت کرتی ہیں۔

خدا تعالیٰ نے جو خصوصیات مؤمن مَردوں کی بیان کی ہیں، وہی خصوصیات مؤمن عورتوں کے لئے رکھی ہیں۔ قرآن کی رُو سے انسانیت کی تمام صلاحیتیں مَردوں اور عورتوں میں موجود ہیں۔ ان صلاحیتوں کی نشوونما اور ان کا صحیح و درست استعمال ہی زندگی کا نصب العین ہے۔ لہٰذا اس باب میں مَردوں اور عورتوں میں کوئی فرق نہیں۔ ان میں سے کسی صنف کو دوسری صنف پر کوئی فوقیت نہیں۔ دونوں جنّت میں داخل ہونے کا حق و اہلیت رکھتے ہیں۔ قرآن کریم کی یہ آیاتِ بیّنات سامنے رکھئے اور دیکھئے کہ ان میں مرد و عورت کو کس طرح ایک دوسرے کے دوش بدوش رکھا گیا ہے۔ إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ (۳۳/۳۵) اگر مرد یہ صلاحیت رکھتے ہیں کہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی ذات کی تکمیل کریں تو عورتیں بھی اس سے بہرہ ہیں۔ مُؤْمِنِينَ اور مُؤْمِنَاتِ۔ اگر مرد اس جماعت کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمّہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں۔ قَانِتِينَ اور قَانِتَاتِ۔ اگر مَردوں میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنی استعداد کی حفاظت کرتے ہوئے اسے صرف قانونِ خداوندی کے مطابق استعمال میں لائیں، تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں۔ الصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ

اگر مرد اپنے اعمال سے اپنے دعوائے ایمان کی صداقت دکھاتے ہیں۔ تو عورتیں بھی اس میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ صٰبِرِیْنَ اور صٰبِرٰتِ۔ اگر مرد ثابت قدمی اختیار کرتے ہیں تو عورتیں بھی ثابت قدم ہو سکتی ہیں۔ اَلْخٰشِعِیْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ۔ اگر مردوں کی یہ خوبی ہے کہ جیسے جیسے ان کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں، وہ شاخِ ثمردار کی طرح قانونِ الٰہی کی اطاعت میں اور جھکتے چلے جائیں تو عورتیں بھی اپنے اندر یہ وصف رکھتی ہیں۔ مُتَصَدِّقِیْنَ اور مُتَصَدِّقٰتِ۔ اگر مرد ایثار کر سکتے ہیں تو عورتیں بھی کر سکتی ہیں۔ اَلصَّآئِمِیْنَ وَ الصَّآئِمٰتِ۔ اگر مرد اپنے اوپر یہ قابو رکھ سکتے ہیں کہ جہاں سے انہیں روکا جائے رُک جائیں تو عورتوں میں بھی یہ حوصلہ ہوتا ہے۔ حٰفِظِیْنَ اور حٰفِظٰتِ۔ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھتے ہیں تو عورتیں بھی اس سے بے بہرہ نہیں۔ اَلذّٰکِرِیْنَ وَالذّٰکِرٰتِ۔ اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور ہر وقت اسے پیشِ نظر رکھنے کا ثبوت دیتے ہیں تو عورتیں بھی اس کی اہل ہیں۔

جب یہ صلاحیتیں دونوں میں پائی جاتی ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے ایک جیسے ہونے چاہئیں۔ فلہٰذا نظامِ خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے۔ اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمْ مَّغْفِرَۃً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا۔ قرآن نے یہ اعلانِ عظیم آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے کیا تھا کہ وَلَھُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْھِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ۔ قاعدہ اور قانون کی رُو سے عورتوں کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنے ان کے فرائض ہیں۔ اسلئے قانون کی نگاہ میں مرد و عورت دونوں کو مساوی درجہ حاصل ہے۔ قرآنِ پاک کی یہ آیت وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ مرد اور عورت دونوں کا واجب التکریم ہونا ثابت کرتی ہے۔ آیت کا مطلب ہے ہم نے بنی آدم کو واجب التکریم بنایا ہے۔ اس سے مراد، صرف مرد نہیں۔ مرد اور عورت دونوں ہیں۔ عربی زبان کے قاعدے کے مطابق مرد و عورت کے مشترکہ ذکر کو بنو فلاں کہا جاتا ہے۔ ان میں بنی اسرائیل سے مراد، قوم بنی اسرائیل کے صرف مرد ہی نہیں، مرد اور عورت سب ہیں۔ اسی طرح، جب قرآن یہ کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ پیدا کیا ہے تو اس میں مرد اور عورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔ قرآن انسان کو خطاب کرتا ہے، صرف مردوں کو نہیں۔

قرآن نے جہاں مرد اور عورت کو زوج کہا ہے تو عورت کو مرد کی زوج نہیں کہا، بلکہ انسانوں سے مخاطب ہوتا ہے جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا۔ "اللہ نے تم میں سے تمہارے لئے زوج بنا دیئے"۔ زوج رفیق اور ساتھی کو کہتے ہیں۔ یعنی مرد اور عورت، ایک دوسرے کے رفیق اور ساتھی ہیں۔ ان میں سے ایک بالادست نہیں دوسرا زیردست نہیں۔ بلکہ مرد کی تکمیل عورت سے، اور عورت کی تکمیل مرد سے ہوتی ہے۔ مرد و عورت کے اسی تعلق کو قرآن نے دوسری جگہ لباس سے تشبیہ دی ہے۔ جہاں فرمایا کہ ھُنَّ لِبَاسٌ لَّکُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّھُنَّ "تم ایک دوسرے کے لئے بمنزلہ لباس کے ہو، جو بدن کے ساتھ پوری طرح موافقت رکھتا ہے"۔ مرد و عورت کی باہمی رفاقت سے ایک دوسرے کی صلاحیتیں نشوونما پاتی اور توازن پذیر ہوتی ہیں۔ لہٰذا مرد کا یہ سمجھنا کہ میں عورت

سے افضل ہوں، محض اپنے آپ کو فریب دینا ہے اور جس کی اللہ کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں۔

اب فرائض اور ذمہ داریوں کی طرف نظر ڈالیے۔ اس جگہ مرد اور عورت کے راستے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ زندگی کے جن گوشوں میں مرد اور عورت کی خصوصیات یکساں ہیں۔ مثلاً عقل و بصیرت کی خصوصیت، وہاں یہ دونوں ایک دوسرے کے ہمراہ ہوں گے۔ مگر قدرت نے ان کے فطری وظائفِ زندگی میں جو فرق رکھا ہے، اُسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ فطری تقسیمِ کار کی رُو سے عورت کے ذمہ اولاد کی پیدائش، پرورش اور ابتدائی تربیت ہے۔ ان فرائض کی ادائیگی میں اس کا بیشتر وقت اور توانائی صرف ہو جاتی ہے اور اس دوران میں وہ طبعی طور پر اس قابل نہیں ہوتی کہ زندگی کے سخت محنت و مشقت والے شعبوں میں حصہ لے سکے۔ اس سے معاشرہ میں جو کمی پیدا ہوتی ہے، اُس کو مرد پورا کرتا ہے کیونکہ اس کے سامنے کوئی ایسی رکاوٹیں نہیں ہوتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے اَلرِّجَال کو اَلنِّسَآء پر قَوَّامُوْن بنایا ہے۔ یعنی عورتوں کی روزی مہیا کرنے والے۔ ظاہر ہے کہ یہ چیز مرد کو عورت کے مقابلہ میں اونچا نہیں کرتی۔ برعکس اس کے عورت اس کی کمی کو پورا کرتی ہے وہ عورت کی اس کمی کو پورا کرتا ہے۔ عورت ایک نوعیت کی معاشرہ میں اضافہ کا سبب بنتی ہے، مرد دوسری نوعیت سے۔ ایک کو ایک لحاظ سے شرف حاصل ہے، دوسرے کو دوسری وجہ سے۔ تقسیمِ کار کا یہ ایسا بنیادی اصول ہے، جو ایسا معاشرہ تشکیل دیتا ہے جس کے بعد عورت کے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہیں ہو سکتا کہ میں عورت کیوں بن گئی۔ مرد کیوں نہ بنی۔ مسلم خاتون کو، آج کی ظاہر بینی کو ہمیشہ یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ مرد بننے کی جو خواہش، اپنے بلند مقام کو کھو دینا اور سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ قرآن نے اسی لئے کہا تھا کہ وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ۔ جو خوبیاں ہم نے ایک نوع کو دی ہیں، دوسری نوع کو کبھی نہیں چاہیے کہ ان کی تمنا میں اپنے مقامِ افضلیت کو ضائع کر دے۔ مرد کی برتری مرد ہونے میں اور عورت کی برتری عورت ہونے میں پنہاں ہے۔ مرد و عورت کے سعی و عمل کے میدان الگ الگ ہیں۔ اپنے اپنے میدان میں اپنے اپنے لئے وقف ہیں تو فرائض و ذمہ داری پوری محنت اور حسن و خوبی سے سرانجام دیتے ہیں کہ معاشرہ کی بہبودی اور بھلائی ہے۔

عورت اور مرد کے فرائض میں جو فرق ہے، اس کے لئے ان دونوں کی ساخت میں حیاتیاتی اختلاف ہے۔ اسی اختلاف کی وجہ سے عورت کی زندگی کا ایک حصہ بچوں کی پیدائش و پرورش کی ذمہ داریوں کو نبھانے میں گزرتا ہے جس کی وجہ سے وہ دوسرے ایسے عملی کاموں میں شریک نہیں ہو سکتی جنہیں عام طور پر مرد کرتے ہیں۔ مگر یہ معذوری عورت کا درجہ مرد کے مقابلہ میں کم نہیں کر دیتی، بلکہ اس اعتبار سے تو عورت کا مقام مرد کے مقابلہ میں برتر ہے کیونکہ اگر وہ چاہے تو اپنے ان فرائض کو سرانجام دیتے ہوئے ہر وہ کام کر سکتی ہے جسے مرد کرتے ہیں۔ لیکن مرد ہزار چاہنے کے باوجود ان امور کو سرانجام نہیں دے سکتا جنہیں عورت کی معذوریاں سرانجام دیتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر عورتیں مردوں کی ذمہ داریاں

سنبھال لیں، اور اپنے فرائض سے منہ موڑ لیں تو اُن کے فرائض کی تکمیل کون کریگا؟ مردوں کو تو ان فرائض کو ادا کرنے کی اہلیت ہی نہیں دی گئی۔ اس کے بعد فطرت کا پروگرام تہ و بالا نہیں ہو جائے گا کیا؟

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ شجرِ انسانیت کی بالیدگی اور نسلِ انسانی کی زندگی عورت کے دم سے ہی قائم ہے۔ پھر اگر کوئی طاہرہ بیٹی اپنی اس خصوصیت سے اظہارِ نفرت کرتی ہے، اور اپنی ان اہم ذمہ داریوں کو، اپنے لئے باعثِ شرم سمجھتی ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ فطرت کے نقشے میں بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔ اور یوں وہ اپنے آپ کو اس اطمینان سے بھی محروم کر دیتی ہے جو اسے فطرت کے متعین کردہ فرائض کی ادائیگی سے حاصل ہوتا ہے۔

ایک عورت، عورت ہوتے ہوئے ہزار عزتوں کی مستحق، اور لاکھ عظمتوں کی سزاوار ہے۔ اگر اسے اپنے عورت ہونے پر عار ہے تو اس کی زندگی بیکار ہے۔ اور یہ صرف اس کی انتہائی بدقسمتی نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی کی شوریدہ بختی ہوگی۔ انسانیت کی تشکیل میں گھر بڑی بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ اور تعلقاتِ انسانی میں خاندان کا بڑا دخل ہے جو معاشرہ اس اساس و بنیاد کو قائم نہیں رکھتا (جس کی مثال یورپ اور روس ہیں) وہ آئندہ نسلوں کو آوارہ و سرگشتہ بنا دیتا ہے۔ گھر اور خاندان کو بنانے اور سنوارنے میں عورت کی حیثیت مرکزی ہے۔ عورت ہی گھر کو جنت بنا سکتی ہے آنے والی نسلوں کو باوقار انسان بنانے میں عورت کا بڑا حصہ ہے۔ اگر عورت اپنے اس اہم اور قابلِ فخر فریضہ کو چھوڑ کر مردوں کے فرائض کی طرف رجوع کرتی ہے تو وہ نہ صرف اپنے آپ پر بلکہ معاشرہ اور انسانیت پر ظلم کرتی ہے۔ بلاشبہ عورت، مردوں کے ساتھ ساتھ حیاتِ زندگی کے دوسرے شعبوں میں شریک ہو سکتی ہے۔ مگر اس صورت میں کہ پہلے اپنے اولین فرائض کی تکمیل کر لے۔

دیکھئے! عورت کی اس عظمت کو قرآن کریم نے کس طرح اجاگر کیا ہے، اس کی ہمارے رہنما حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے کس عمدگی سے ترجمانی کی ہے

جہاں را محکمی از امہات است   نہادِ شان امینِ ممکنات است
اگر این نکتہ را قومے نداند   نظامِ کاروبارش بے ثبات است

آخر میں اپنی طاہرہ بہنوں سے یہ میری استدعا ہے کہ وہ اپنے نظامِ حیات کو وحیٔ خداوندی کے تابع رکھ کر مسلمان عورت کا ایسا نمونہ پیش کریں کہ جس سے دوسری راہ گم کردہ بہنوں کی جامد ذہنیتوں میں ایسا انقلاب بپا ہو، جو انھیں کشاں کشاں قرآن کی طرف لے آئے اور یوں یہ پوری زمین، اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔

بچّوں کی تربیّت و تعلیم کی اہمیّت

محترمہ سکندرہ، بیگم ڈاکٹر ریاض صاحب - گلبرگ - لاہور

تاریخِ انسانی کے کسی دَور کو لیجئے، ہر قوم کی ترقی کا دارومدار اس کی نئی نسل کے نظریاتِ زندگی اور تعمیری خیالات پر ہا ہے ایک بچّہ صرف اپنے ماں باپ کا نہیں، بلکہ پُوری قوم کا سرمایہ ہے — قیمتی سرمایہ — ایسا سرمایہ کہ اگر اس کی حفاظت نہ کی جائے، اور اُسے اس قابل نہ بنایا جائے کہ وہ اپنی قوم کا اچّھا فرد بنے، اُس کے وقار کو قائم رکھے اور اس کی ترقی و خوشحالی میں اضافہ کرے، تو آہستہ آہستہ وہ قوم اپنی خداداد صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے۔ قیمتی سرمایہ میں کمی، قوم کو جو نقصان پہنچاتی ہے وہ صدیوں میں جا کر اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اور ذمہ داری اس کی والدین اور استاد دونوں پر عائد ہوتی ہے۔

تمام بچّے قوانینِ فطرت کے تحت اس دنیا میں آتے ہیں۔ کوئی ماں یہ نہیں جان سکتی کہ ہر آن رحمِ مادر میں کس طرح اُن کی پرورش ہوتی ہے۔ اور نہ کسی ماں کو ان کی اُس وقت کی پرورش میں کوئی دخل ہوتا ہے۔ ماں کے فرائض اور اس کی ذمہ داریاں ظاہری طور پر اُس وقت شروع ہوتی ہیں۔ جب بچّہ اس دنیا میں آجاتا ہے۔ ویسے تو اب سائنسی ترقی کا دَور ہے اور ہمارے سائنسدان یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ بچّے کی پیدائش سے قبل بھی ماں کی ذہنی کیفیات کا اثر بچّے پر پڑتا ہے۔ اور ماں کے اس زمانہ کے عادات و خصائل بھی اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

بچّے کی پرورش اور تربیت دو مختلف چیزیں ہیں۔ پرورشِ جسمانی بھی اُسی قدر لازمی ہے جس قدر کہ تربیتِ ذہنی تندرست و توانا بچّے، نہ صرف ماں باپ کے لئے باعثِ رحمت ہیں، بلکہ پُوری قوم کے لئے سامانِ نعمت ہیں۔ ایک محاورہ ہے کہ "ایک تندرست جسم میں ہی ایک تندرست دماغ تربیت پاتا ہے۔" چھوٹے بچّوں کی جسمانی پرورش کے لئے بھی ہر ماں کو اصول و قواعد جاننے لازمی ہیں، اور ساتھ ہی ان کی ذہنی نشوونما کے طریقوں سے بھی واقفیت ہونی چاہیئے۔

(۱) بچّوں کی تربیت کے سلسلہ میں تمام والدین کو یہ امر بخوبی ذہن نشین کر لینا چاہیئے اور اس حقیقت کو ہر وقت یاد رکھنا چاہیئے کہ بچّے قدرت کا بہترین عطیہ، قوم کا قیمتی سرمایہ، اور اللہ تبارک و تعالیٰ کی مقدس امانت ہیں۔ والدین کی حیثیت صرف ایک امین اور خدمتگذار کی ہے۔ ہر ماں اور ہر باپ کو بارگاہِ الٰہی میں جواب دہی کرنی پڑے گی کہ جو امانت ان کے سپرد کی گئی تھی انھوں نے اس کی حفاظت اور تربیتِ روحانی و جسمانی کے لئے کیا کچھ کیا؟

(۲) - ہر بچّہ، قدرت کی طرف سے خوابیدہ صلاحیتیں لئے ہوئے اس جہاں میں آتا ہے۔ اور جب تک اُن صلاحیتوں کی صحیح نشوونما نہ ہو، اُس کی شخصیت نامکمل رہتی ہے۔ والدین کے پیشِ نظر دوسرا نکتہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی ذہنی سطح کے

مطابق پوری پوری کوشش کریں کہ ان کا بچہ، وہ کچھ بن جائے جس کے بننے کی صلاحیت قدرت نے اُسے عطا کی ہے انہیں بچہ پر اس کے رجحانات کے خلاف زبردستی نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ مشفق، ناصح اور ہمدرد و رہبر ہونا چاہیئے۔ جابر نگران اور سخت گیر مختارِ کُل بن کر وہ اپنی راہ میں مزید دشواریاں خود پیدا کر لیتے ہیں۔

(۳)۔ ہر بچہ کی اپنی اپنی پسند ہوتی ہے اور اپنا جدا معیار اور پیمانہ۔ اس کا لحاظ بھی رکھنا ضروری ہے۔ اپنی ذاتی پسند، اپنے معیار، اپنے پیمانوں سے بچوں پر تسلط قائم کرنا نادانی ہے۔

(۴)۔ ہر بچے میں عزتِ نفس کا جذبہ ہوتا ہے۔ چاہے وہ ظاہر ہو یا پوشیدہ۔ جس طرح ہمیں اپنی بے عزتی کا رنج اور افسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح بچہ بھی یہ جذبات رکھتا ہے۔ اور چونکہ اس کا پیمانہ، اس کی عمر اور ذہنی سطح کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لئے وہ ہم سے بھی زیادہ محسوس کرتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات زیادہ حساس بچوں کی پوری زندگی اُن کے بچپن کے حادثات اور واقعات کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔

(۵)۔ بچوں کی مثال نازک نگینوں اور صدف کے اندر پوشیدہ موتیوں کی طرح ہے۔ جوہری اپنی پوری کاریگری سے نگینے جڑتا اور موتی صاف کرتا ہے۔ اس نازک کام کو وہ کسی دوسرے نااہل کے سپرد نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر نگینہ یا موتی کو نقصان پہنچا تو وہ اپنی قیمت کھو دیں گے۔ پس اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ اگر ہم بچے کی صحیح تعلیم و تربیت نہیں کرتے، اس میں کوئی خامی رہ جاتی ہے تو اپنے قیمتی سرمایہ کو ضائع کرنے کی ذمہ داری ہم ہی پر آتی ہے۔

بچوں سے محبت، ماں کا پہلا فرض ہے۔ لیکن ایک حد کے اندر۔ پانی اور آگ، بجلی اور ہوا، تمام کائناتی قوتوں کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ کس طرح ایک مخصوص و معین حد کے اندر، ایک خاص طریقے اور ضابطے کے ساتھ یہ قوتیں ہمارے لئے رحمت و برکت کا باعث بنتی ہیں۔ اور کس طرح اگر حد اور ضابطہ کو توڑ دیا جائے تو یہ ہماری تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ درمیان کی راہ ہمیشہ بہتر ہوتی ہے۔ بیجا لاڈ اور پیار بھی بچہ کو تباہ کر دیتا ہے اور بیجا سختی بھی۔ ہر وقت کی ڈانٹ ڈپٹ، روک ٹوک بھی اُس کی شخصیت کو اُبھرنے نہیں دیتی۔

(۶)۔ بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔ اور ان کی شخصیت کا احترام لازمی۔ اپنی سچی محبت اور خدمت سے ہم ایک بچہ کی نشوونما میں جو امداد کرتے ہیں وہ سخت گیری اور طعن و تشنیع سے نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنے غصے کو قابو میں رکھنا چاہیئے۔ اپنی غلطیوں کا ذمہ دار معصوم بچوں کو ٹھہرا کر اُن پر غصہ اتارنے کا کوئی حق نہیں ہونا چاہیئے۔

(۷)۔ ایک مثال ہے کہ "بچہ ماں کے پیٹ سے سیکھا سکھایا پیدا نہیں ہوتا"۔ ہر بچہ کو سکھایا جاتا ہے۔ انسانی بچہ، اپنا نیک و بد اور نفع و نقصان کچھ نہیں جانتا۔ اس کو ہر قدم پر رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے سب سے پہلے رہبر خود اس کے ماں باپ ہوتے ہیں۔ اور پھر درجہ بدرجہ دیگر اہلِ خانہ۔ نانا۔ نانی۔ دادا، دادی۔ بہن بھائی وغیرہم۔ لہٰذا یہ بھی غلط ہے کہ بچہ کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔ نیک و بد کا فرق نہ بتایا جائے۔ برائی سے نہ روکا جائے۔ اور

اپنے دل کو غلط تسلیاں دے لی جائیں کہ "کیا ہے، بچّہ ہے، جوان ہوگا اور عقل آئے گی تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گا" یہ طریقہ بھی درست نہیں۔ یاد رکھئے کہ عادت پختہ ہونے کے بعد مشکل سے ہی بدلتی ہے۔ جس بچّہ کو بچپن سے ہی جھوٹ بولنے، دھوکا دینے، چوری کرنے اور غیبت وغیرہ کی عادات پڑ جائیں۔ وہ کبھی مخلص اور دیانتدار نہیں بن سکتا ہے۔

(۸)۔ میں اپنے ذاتی تجربات، بچپن کے واقعات اور خاندانی ماحول واثرات کی بناء پر جو نتیجہ اخذ کر سکی ہوں وہ یہ ہے کہ بچّوں کی تربیت، ماں اور باپ دونوں کا مشترکہ فریضہ ہے۔ لیکن ماں کا زیادہ۔ تقسیم کار کی بناء پر گھر سے باہر کی ذمّہ داریوں اور معاشی ضروریات کی فراہمی کا بار مرد کے کاندھوں پر زیادہ ہے۔ عورت گھریلو معاملات کی مالکہ اور ذمّہ دار ہے، اس لئے بچّوں کی تربیت کا اصل بار اور اُن کے مناسب آرام و آسائش اور تعلیم و تربیت ہر بات کی ذمّہ داریاں ماں پر ہوتی ہیں۔ باپ کا جا و بیجا دخل، انتظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔ اُسے صرف ایک مخلص مشیر کا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ ابتدائی تعلیم و تربیت پُوری طرح ماں کے ذمّہ ہو۔ البتّہ لڑکوں کے لئے بلوغ کے وقت باپ کی رائے اور مشورہ کو زیادہ اہمیت ہو، اور اس وقت ماں صرف ایک مخلص مشیر ہو۔

(۹)۔ ہر بچّے کو گھر میں اس کا جائز مقام حاصل ہونا چاہیئے۔ بڑے اور چھوٹے کا لحاظ قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں۔ ہر بچّہ، اپنی جگہ پر واجب التکریم ہے۔ کسی ایک کو دوسرے سے زیادہ رعایت نہ دی جائے۔ کھانے پینے اور لباس و دیگر ضروریاتِ زندگی کے لئے کسی کو دوسرے پر ترجیح نہ ہو۔ ہر ایک کی غلطی کا بار اُسی پر ہو۔ ایک کی غلطی کی سزا دوسرے کو نہ دی جائے۔ نہ یہ ہو کہ ایک کو تو اُسی غلطی پر سزا دی جائے اور دوسرے کو کچھ نہ کہا جائے۔

(۱۰)۔ بچّے کو غلطی سے آگاہ کرنا لازمی ہے اور نیک راہ بتانا بھی ضروری۔ لیکن اس احتیاط کے ساتھ کہ اس کی عزتِ نفس کو دھکا نہ لگے۔ نرمی، محبّت اور رواداری یہ وصف اپنی حد کے اندر توازن قائم رکھتے ہوئے ہوں۔ غلطیوں کو بھی محبّت کی نگاہ سے دیکھا جائے، اور نرمی سے غلطی کے نتائج سے آگاہ کر کے آئندہ کے لئے احتیاط کا سبق دیا جائے۔ اگر اثر نہ ہو تو گھبرا کر غصّے ہونا بیکار ہے۔ اور لعن وطعن اُس سے بھی زیادہ مُضر۔

بچّہ والدین کے سامنے کچھ کہہ نہیں سکتا۔ لیکن صرف ایک عمر تک۔ اور پھر نفسیاتی طور پر یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کی شخصیت کا احترام نہ کیا جائے اور اُسے سچّی محبّت اور رہنمائی گھر سے نہ ملے، تو وہ غیر شعوری طور پر ماں باپ یا دیگر اہلِ خانہ سے متنفّر اور دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ مقام آجاتا ہے جہاں اُسے کسی کی پرواہ نہیں رہتی، بلکہ وہ والدین کو دُکھ پہنچا کر خوش ہوتا ہے۔

بار بار اور مختلف طریقوں سے صحیح بات کو دُہراتے رہنے سے، اور پسندیدہ اخلاق و بلند اقدارِ زندگی کی مثالوں سے بچّے پر خوشگوار اثرات پڑتے ہیں۔ اگر شروع ہی سے بچّے کے دل میں ماں کی محبّت و احترام قائم ہو جائے تو وہ از خود بہت سی غلطیوں سے محفوظ رہتا ہے۔

(۱۱) - ہر بچے کی طبیعت جدا ہوتی ہے، کوئی اپنی غلطی جلد تسلیم کر لیتا ہے اور اُس پر پشیمان ہوتا ہے، کوئی اپنی غلطی تسلیم نہیں کرتا اور اپنے نظریہ کو ہر حال میں درست سمجھتا ہے۔ وہ صحیح مشورہ کو بھی اپنے پر زیادتی خیال کرتا ہے۔ یہاں بھی صبر و ضبط سے کام لینا چاہیئے اور بچے کو موقعہ دینا چاہیئے کہ وہ از خود غور کرے۔ اور اپنی غلطی کو سوچ سمجھ کر تسلیم کرے اور پھر آپ کی طرف رجوع ہو۔ زبردستی معافی منگوانا بالکل بیکار ہوتا ہے۔

(۱۲) - بچوں کے آپس کے جھگڑے نوے فیصدی از خود حل ہو جاتے ہیں۔ اُن میں بے جا دخل دینا، آپس میں زیادہ فساد کا باعث بنتا ہے۔ دور اندیشی یہی ہے کہ اپنے کھیل کود کے فیصلے اُن کو خود کرنے دیئے جائیں۔ اگر وہ از خود رجوع کریں تو معاملہ دونوں فریق سے صبر و ضبط کے ساتھ سُن کر فیصلہ عدل کے ساتھ کیا جائے۔ جس کی زیادتی ہو اُس کو نرمی اور محبت سے سمجھانا چاہیئے۔ اگر زیادتی کرنے والا اپنی زیادتی پر قائم رہے تو پھر دوسروں کو یہ تاکید کرنی چاہیئے کہ وہ اس کے ساتھ تعاون نہ کریں۔ کچھ عرصہ کے لئے کھیل و تفریح میں اُسے شریک نہ کریں، اور اُسے اتنا وقت مل جائے کہ وہ اپنے لئے خود سوچے اور اپنی زیادتی کو محسوس کر کے خود دستِ محبت بڑھائے۔ ایسی صُلح ہمیشہ پائیدار ہوتی ہے۔

(۱۳) - بچوں میں خود اعتمادی۔ قوتِ فیصلہ اور ذمہ داریوں کا احساس پیدا کرنا اور انہیں بیدار رکھنا، ان کی شخصیت کی نشوونما کے لئے لازمی ہے۔ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں اپنا فیصلہ منوانا اُن کی شخصیت کو اُبھرنے اور سنورنے نہیں دیگا۔ مثال کے طور پر کھانے پینے کے معاملہ میں بہت زیادہ اصرار، یا لباس کی وضع قطع اور رنگ کے معاملہ میں اپنی پسند اور فیصلہ زبردستی اُن پر عائد کرنا اُن کی قوتِ فیصلہ کو کمزور کرتا ہے۔ مناسب غذا اور سادہ لباس کی طرف رہنمائی بہتر ہے۔ اپنے حالات کے مطابق بعض امور میں خاندانی روایات کی پابندی غیروں کی نقالی سے بہتر ہے۔ "کوّا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا"۔

(۱۴) - بچوں کے سامنے اپنی مثال ہر وقت دینا کہ ہم ایسے تھے اور ایسا کرتے تھے، کوئی قابلِ تعریف بات نہیں۔ ہم کیا ہیں بچوں کو یہی نظر آسکتا ہے۔ اس لئے پہلے اپنے کردار میں پاکیزگی اور بلندی پیدا کرنی لازمی ہے۔ ہر وہ خوبی جو ہم اپنے بچے میں دیکھنا چاہتے ہیں پہلے ہم میں نمایاں ہونی چاہیئے۔ اگر ہم اپنے غصہ کو ضبط نہیں کر سکتے۔ اگر ہم غلط بیوں سے درگذر نہیں کر سکتے۔ اگر ہم غلط بیانیاں کرتے ہیں۔ دوسروں پر اعتراضات اور طعن و تشنیع ہمارا شیوہ ہے تو ہماری گود میں پلے ہوئے بچے کس طرح اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ کردار کے مالک بن سکتے ہیں؟ محبت و صداقت، خدمت و محنت، ضبط و تحمل، صبر و استقلال، شجاعت اور سخاوت کا جو سبق ہم اُن کو گود میں دیں گے، وہ کبھی رائیگاں نہیں جا سکتا۔ محبت اور خدمت صرف ماں باپ اور بھائی بہنوں کی نہیں، بلکہ پوری انسانیت کی۔ درجہ بدرجہ، جوں جوں عقل و فکر کی سطح بلند ہوتی جائے، یہ ذہن نشین کراتے رہنا چاہیئے کہ ہر فردِ انسانی دوسرے افراد کی محنت اور محبت کا مرہونِ منت ہے۔ اور اپنے اپنے مقام پر، ہر ایک کو دوسرے کی خدمت اور آرام کے لئے اپنا حصہ پورا پورا ادا کرنا چاہیئے۔

(۱۵) - بیٹا اور بیٹی، دونوں نعمت خداوندی ہیں۔ دونوں کے حقوق برابر ہیں۔ اس لئے تربیت کے معاملہ میں بھی دونوں کو یکساں طور پر سمجھنا چاہیئے۔ لڑکوں کو ہر معاملہ میں رعایت دینا اور لڑکیوں پر سخت پابندی رکھنا حق و عدل کے منافی ہے، اور بعض اوقات ایسے

نتائج دونوں کے حق میں مضر ثابت ہوتے ہیں۔

لڑکوں کو باہر کے کام سے دلچسپی زیادہ ہوتی ہے، اس لئے عمر کے مطابق، روزمرہ کے کاموں میں اُن سے مدد لینا، ایک طرف اُن میں خود اعتمادی پیدا کرتا ہے، کام کا طریقہ سکھاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے کی خدمت، مدد اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

لڑکیوں کو گھر کے اندر کام کاج میں ضرور دلچسپی دلانا چاہیئے۔ عورت کا اوّلین مقام بہرصورت گھر ہی ہے۔ یہ قانونِ قدرت ہے، اس کے خلاف جنگ کرنا، نادانی ہے۔ تعلیم انتہائی ضروری ہے۔ دونوں کے لئے۔ لیکن لڑکیوں کے لئے تعلیم کے علاوہ، امورِ خانہ داری میں مہارت بھی لازمی ہے۔ جس طرح لڑکے باہر کے کاموں سے خوش ہوتے ہیں، اور اُس سے اُن میں خود اعتمادی و خدمت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اسی طرح لڑکیاں بھی گھر کے کام کاج سے سلیقہ، صفائی اور کفایت شعاری سیکھتی ہیں اور اپنی آئندہ ذمہ داریوں کا احساس اُن میں پیدا ہوتا ہے۔

لڑکوں کی تفریحات میں قدرے آزادی بھی ضروری ہے لیکن عمر کے لحاظ سے۔ وہ ہر وقت گھر میں کھیل کر خوش نہیں رہ سکتے۔ اگر گھر اتنا بڑا ہو کہ ان کے کھیل کے لئے موزوں مقام مخصوص ہو سکے تو اس حالت میں انہیں اپنے ساتھیوں کو گھر پر بلانے کی اجازت ہونی چاہیئے، اور ساتھ ہی غل اور شور کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے۔ یہ نہیں کہ اُن کو باہر کھیل کے لئے بھی نہ جانے دیا جائے اور شور و غل پر غصے ہو کر ڈانٹا جائے۔ بچے اپنے ساتھیوں کے سامنے اسے اپنی ذلت سمجھتے ہیں۔ اُن کی عزتِ نفس کو دھکا لگتا ہے، اور اس کا اثر والدین کے خلاف ان کے جذبات میں اُبھرتا ہے۔

لڑکیوں کے لئے بھی تفریح اور ورزش وغیرہ اسی قدر ضروری ہے۔ لیکن تفریح کا انتظام اگر گھر پر ہی ہو سکے تو بہتر ہے۔ ناسمجھ لڑکیوں کو تنہا کلبوں اور پارکوں میں کھیل کود کیلئے بھیج دینا ان کی آئندہ زندگی کے لئے نقصان دہ ہے۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں لڑکے اور لڑکی کی تربیت میں کچھ فرق کرنا لازمی ہے۔

حفاظتِ عفت و عصمت مستقل قدر ہے، اور دونوں کے لئے یکساں طور پر لازمی۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے معاشرہ نے دونوں کے لئے مختلف پیمانے بنا رکھے ہیں۔ اس لئے جب تک ہم اپنے معاشرہ کو نہ بدلیں اور صحیح اقدار کو نہ قائم کریں۔ اُس وقت تک یہ ہمارا مقدس فرض ہے کہ جو امانت بیٹی کی صورت میں ہمیں سونپی گئی ہے اُس کی حفاظت میں کسی ادنیٰ سی غلطی کا ارتکاب بھی نہ ہونے دیں۔ ہمارے موجودہ معاشرہ میں، بدطینت عناصر کی زیادتی ہمارے فرائض کو اور بھی شدید بنا دیتی ہے۔ یہ حفاظتی تدابیر لڑکیوں کے لئے بیجا سختی نہیں ہے۔ بلکہ عینِ محبت و رحمت ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ پاکیزہ ماحول میں پرورش پائی ہوئی لڑکیاں اپنی عصمت کی حفاظت خود کرنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ قرآن، عفتِ قلب و نگاہ پر زور دیتا ہے اور یہی خصوصیات حورانِ جنت کی بتاتا ہے۔ قوم کی تقدیر عورت کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس لئے عورت کو پیکرِ عفت و عصمت ہونا چاہیئے۔ پاکباز اور عقل و فہم کی مالک۔ ہماری بچیوں کو آج کل ذرا سی بھی پابندی ناگوار ہے۔ لیکن اگر شروع ہی سے ان کی تربیت، نظم

(بقیہ صفحہ ۱۱۱ پر دیکھیئے)

میرے تأثرات

محترمہ پروفیسر سعیدہ اختر۔ لیڈی میکیگن ٹریننگ کالج۔ لاہور

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

آج سے تین برس بیشتر، ہم اپنے آپ کو سچا اور پکا مسلمان سمجھتے تھے۔ اور اب جبکہ اسلام کے مطالعہ اور اس کے سمجھنے کا موقعہ ملا تو کچھ کچھ دین تو سمجھ میں آیا ہے، لیکن خود کو مسلمان سمجھنا دشوار ہو گیا ہے —— اگرچہ ایمان اُس وقت بھی یہی تھا کہ دنیا بھر کے مذاہب میں اسلام کا مقام ارفع و اعلیٰ ہے۔ اور اسلام رہتی دنیا تک کے لیے نوعِ انسانی کی راہبری کا پیغام لیکر آیا ہے۔ لیکن یہ پیغام پوری نوعِ انسانی تک کیوں نہ پہنچا؟ کیسے پہنچے گا؟ کون پہنچائے گا؟ ان سوالات کا جواب، اپنے بس کی بات نہ تھی۔ اسلام اپنی بے پناہ وسعتوں اور بلند ترین اقدارِ حیات کھوئے ہوئے صرف پانچ ارکان میں محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ اور ہماری سمجھ کے مطابق مسلمان ہونے کا مقصد یہی تھا کہ ان پانچ ارکان میں سے زیادہ سے زیادہ رکن ادا کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمان ہو جائیں۔ اس اعتبار سے اگر ہم اپنے آپ کو پکا اور سچا مسلمان سمجھتے تھے تو اس میں کچھ ایسا اپنا قصور بھی نہ تھا۔ کلمہ۔ نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج۔ اسلام یہی تو تھا —— کلمۂ طیبہ کا پڑھنا، ایمان لانے کی سب سے پہلی شرط۔ جب کسی کو مسلمان بنایا جاتا ہے تو اسی سے ابتدا کی جاتی ہے۔ اس کے معانی اور عملی پہلو کو سمجھنا تو علیحدہ کی بات ہے، اسے عربی زبان کے صحیح مخرج اور اعراب کے ساتھ ادا ہونا چاہیئے۔ ایرانی بھی شاید اسی طریق پر راتوں رات ایمان لائے تھے کہ دلوں پر مجوسیت کا قبضہ برقرار رہا۔ ہم راتوں رات ایمان لانے والوں میں سے تو نہ تھے۔ مسلمان گھرانوں ہی میں پیدا ہوئے، مگر ایمان کی پہلی شرط بس اسی انداز میں کلمہ پڑھ لینے کی حد سے تجاوز نہ کر سکی۔ ورنہ اگر کلمۂ طیبہ ہی کو سمجھ کر اسے اپنی زندگی میں شریک کر لیا ہوتا تو ایک عظیم انقلاب گرد و پیش میں آجاتا، اور یہ بے تحاشا شرک۔ بے شمار بدعتیں اگر چاہتیں بھی تو مسلمانوں کی عملی زندگی میں داخل ہونے کا کوئی راستہ ڈھونڈ نہ پاتیں —— ہم اس کلمہ کو دن میں کئی بار استعمال کرتے ہیں۔ خود بھی پڑھتے ہیں اور بچوں کو سکھلاتے ہیں۔ لیکن جب کسی بچے کے پیٹ میں درد اٹھتا ہے۔ آنکھ، ناک، کان، دانت میں کہیں تکلیف ہوتی ہے تو بغیر مولوی صاحب کے دم کیے جا ہی نہیں سکتی۔ اور باری کا بخار تو جب تک صبح سویرے ٹونے ٹوٹکے نہ کیے جائیں ممکن ہی نہیں کہ اُتر جائے۔ سوکھے کی بیماری ہو تو کسی کا سایہ ہوتا ہے۔ دوا دارو کا تو کوئی کام ہی نہیں۔ نہ ہی "بیچارے اللہ میاں" کہیں بیچ میں آتے ہیں۔ زندگی کا کوئی مسئلہ ہو، کوئی دقت ہو اُسے دُور کرنے والے پیر جی ہیں یا کسی تکیہ پر بیٹھے ہوئے سادھو فقیر۔ جو کرامات ان کے پاس ہیں، وہ بھلا اللہ میاں کے دیے

ہوئے علم سے ایجاد کردہ ادویات میں کہاں ہو سکتی ہیں۔ ہاں اگر بچہ مر گیا تو پھر سارا الزام اللہ میاں کے سر ــــ خدا کی مرضی یہی تھی کیا کیا جائے ــــ ذہنی، جذباتی، خیالی اعتبار سے، ان جادو ٹونوں، تعویذ گنڈوں، جن اور پری کے سایہ میں الجھی ہوئی عورتوں سے ذرا پوچھ کر دیکھئے۔ "دلہن! تم مسلمان ہو گیا۔؟" بڑی ہی زوردار "ہاں" سُنیئے گا اور ساتھ ہی وہ سُنا دے گی لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ــــ اللہ اکبر، کلمۂ طیبہ پڑھنے والوں کے اعمال و افکار اس کلمہ کی رُوح سے کس قدر دُور ہیں۔؟

ہم بھی تین برس پیشتر کلمہ اسی انداز میں پڑھتے تھے۔ اگرچہ اتنی بدعتیں اس کے ساتھ شریک نہیں کی تھیں۔ تاہم جب کبھی زندگی کا کوئی اہم مسئلہ تفکر و تردّد لیے ہوئے سامنے آتا، تو گولڑہ شریف والے پیر صاحب کو خط ضرور لکھ دیتے تھے کہ آپ کی دعا و برکت کے بغیر یہ گتھی سلجھے گی نہیں۔

دوسرا رکن اسلام کا ہم نے سیکھا تھا نماز ــــ وقت پر باقاعدگی سے پُوری رکعتیں ادا کرتے ہوئے، طمانیتِ قلب کے ساتھ اللہ کے حضور میں جھکنا۔ اور واقعی جب انسان خضوع و خشوع کے ساتھ جھکتا ہے تو اس سے بڑا ہی سکون ملتا ہے اور جب اس کی عادت ہو جاتی ہے تو پھر ایک وقت نماز کا اگر یونہی گزر جائے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے۔ یہی کیفیت اپنی بھی تھی۔ نماز پڑھ لینے سے بڑی ہی مسرت اور اطمینانِ قلب نصیب ہوتا تھا۔ لیکن آج نماز پڑھنے کے بعد وہ دلی خوشی اور اطمینان نہیں ملتا جو تین برس پیشتر ملتا تھا۔ دل اس سے آگے، کسی اور فکر، تمنّا اور تجسّس میں رہتا ہے۔ وہ اطمینان درحقیقت ہمارا اپنا پیدا کردہ تھا۔ اب اس اطمینان کی فکر اور تمنّا رہتی ہے جسے نماز پیدا کرتی ہے۔

آگے بڑھیئے تو اگلا رکن ہے روزہ۔ مجھے اپنے معاشرہ میں یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ہمارے ہاں ایک خاص طبقہ ایسا ہے جو روزے کو نماز پر ترجیح دیتا ہے۔ خصوصاً جہلا کا وہ طبقہ جس کا ذکر میں نے کلمۂ طیبہ کے تذکرے میں بھی کیا ہے۔ اِن مسلمان گھرانوں میں میں نے دیکھا کہ سات سال کا بچہ بھی روزہ رکھتا ہے لیکن نماز سارے گھر میں کوئی نہیں پڑھتا۔ بس روزے رکھتے اور افطار کرتے چلے جاتے ہیں ــــ بلکہ عید کا دن گزار لینے کے بعد پھر روزے رکھنے شروع کر دیتے ہیں ــــ یہ راز میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا کہ یہ لوگ، جو روزے رکھتے ہیں اور نماز نہیں پڑھتے۔ روزہ اُن کی ذہنی سطح پر اتنا اجاگر کیوں ہے۔؟ شاید یہ دیدہ صاحب اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں ــــ بہر حال اپنی استعدادِ جسمانی کے مطابق، ہم بھی یہ رکن ادا کرتے رہے۔

باقی رہ گئے زکوٰۃ اور حج۔ زکوٰۃ تو گویا اللہ میاں کا قرضہ ہے۔ سال بہ سال حساب کرو اور اللہ کا قرضہ چکا دو۔ پھر اللہ میاں جانیں اور ان کے غریب غربا اور محتاج! ــــ ہم جو سَو روپے میں سے اڑھائی روپے نکال کر آگے دیدیتے ہیں تو اس سے وہ ان سب کا رازق بن جاتا ہے جن کا رزق چھین کر ہم کھا جاتے ہیں۔ اور پھر اگر غریب غربا زیادہ ہوتے جاتے ہیں اور ہمارے دیئے ہوئے اڑھائی فی صد سے اللہ میاں بیچارے "اُن سب کا کھانا پورا نہیں کر سکتے تو اس میں ہمارا کیا قصور۔؟ ہمیں تو حکم تھا کہ اڑھائی فیصد دیدو۔ وہ ہم نے دیدیا۔ اب ہم تو ہو گئے پکے مسلمان۔ اور جنّت کے حقدار بھی، اس لئے بے فکر ہیں اور مطمئن۔

غرض یہی کچھ کرتے رہے اور بہ زعمِ خویش خود کو مسلمان سمجھا کیے ـــــ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ ہم اب اس سے کچھ زیادہ کرنے لگے ہیں۔ تاہم خدا کو الزام دینے والی بات ذہن سے نکل گئی ہے۔ اور یہ مسئلہ کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا ہے کہ اللہ کے رازق ہوتے ہوئے بھی سیٹھوں اور ہزاروں انسانوں کو پیٹ بھر کر روٹی کیوں نہیں ملتی۔ ؟

لیجئے باقی رہ گیا حج، اس کے لئے صاحبِ استعداد ہونا ضروری ہے۔ گویا حج کو فرض قرار دے کر اسلام نے اس کی بھی ترغیب دی کہ پیسے جمع کرو تاکہ حج کا فریضہ ادا کر سکو۔ اور کہنے والوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ حج کر لو تو زندگی بھر کے سارے گناہ دُھل جاتے ہیں۔ گویا سارے گناہ اُن کے جسم پر جمے ہوئے تھے۔ آبِ زمزم سے نہا لئے تو ساری گندگی اُتر گئی۔ گناہ کئے جاؤ۔ اللہ رحیم و غفار ہے۔ اور مرنے سے پہلے جب قوائے ذہنی و جسمانی متزلزل ہوئے جا رہے ہوں، جلدی سے جاؤ اور حج کر لو۔ جنت کا پاسپورٹ مل گیا۔ رسول کی شفاعت ہاتھ آگئی۔ اب جنت کی طرف بڑھنے سے کون روک سکتا ہے۔ ؟ جس بکرے کی قربانی حج کے موقع پر دی تھی، وہ بھی تو شفاعت کرے گا۔ پُلِ صراط پر سے بچا کر لے جائے گا۔ ایک بندہ، اور اُسے اتنے بچانے والے۔ دوزخ کی آگ کو تو خود ہی شرمندہ ہو کر گُل ہو جانا چاہیئے۔

ہم جب اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد برسرِ روزگار ہوئے اور اپنے پاس کچھ پیسے بھی جمع ہو گئے کہ تو حسنِ اتفاق کہیئے کہ اپنے کچھ خیر خواہ حج کے لئے جا رہے تھے۔ ہم بھی تیار ہو گئے۔ کچھ اور خیر خواہ ایسے بھی تھے جنھوں نے روکا کہ ابھی سے حج کے لئے کیوں جاتی ہو۔ لیکن اپنے سر پر تو یہ دُھن سوار تھی کہ اسلام کے سارے رکن ادا کر کے دیکھو تو سہی کہ شخصیت میں کتنی وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ چنانچہ ہم نے یہ رکن بھی ادا کر دیا ـــــ اور اب کوئی کسر باقی رہ گئی تھی کہ ہم خود کو پکا مسلمان نہ سمجھتے۔

لیکن ـــــ حج سے واپسی پر بجائے اس کے کہ دل مسرت و خوشی سے جھوم جھوم جاتا اور اپنی شخصیت میں واقعی کسی وسعت کا احساس پیدا ہوتا۔ کسی بہت ہی بڑی کمزوری، بہت بڑی خامی کا احساس بیدار ہونے لگا۔ حج پر ادا ہونے والی رسومات نے طرح طرح کے وسوسے اور شبہات دل میں پیدا کر دیئے ـــــ کیا اسلام صرف یہی ہے ؟ لیکن وہ پیغام کہاں ہے۔ جو ساری دنیا تک کے لئے ہے، جو پوری انسانیت کے لئے ہے ؟ یہ خیالات اُبھرے اور دل ڈانواں ڈول ہو کر نئے سرے سے پھر اسی فکر میں ڈوب سا گیا ـــــ اسلام کے پورے رکن ادا کر کے بھی ہم وہیں کے وہیں تھے ـــــ آخر اسلام کیا ہے ؟ وہ پیغام ابدی کہاں ہے۔ جس میں پوری نوعِ انسانی کی نجات ہے ؟ اسلام نہ مسلمانوں کی انفرادیت میں ملا، نہ اجتماعیت میں۔ نہ کسی کتاب میں۔

قرآن کی تلاوت نیز گام گاڑی کی طرح کرتے چلے آئے تھے۔ بیسیوں مرتبہ پڑھا ہوگا۔ کہیں کہیں اور کبھی کبھی رُک کر ترجمے کی جستجو بھی کی تھی۔ لیکن لگتا یہی تھا کہ سوا چند باتوں کے کہ اللہ میاں نے بار بار یا تو دوزخ سے ڈرایا ہے، یا پھر یہ کہا ہے کہ میری عبادت کرو، آخر اللہ میاں کو اس کی کیا ضرورت تھی کہ ہم اس کے نام کی تسبیح کرتے چلے جائیں۔ ؟ لیکن یہ بات کسی سے کہنے کی جرأت کہاں تھی۔

ایک مرتبہ رمضان کے مہینے میں، یہ فیصلہ کیا کہ اس ماہِ مقدس میں اسلامی کتب کا مطالعہ کیا جائے گا۔ چنانچہ سب سے پہلی کتاب جو ذہن میں آئی وہ تھی بخاری شریف ـــــ اس کی جلدیں لائبریری سے لے کر سامنے میز پر رکھ لیں کہ دن بھر میں کام کے دوران میں جب کبھی بھی فرصت کا وقت ملے گا حدیث کا مطالعہ کیا جائے گا۔ ایک حصہ جوں توں ختم کیا۔ دوسرا با دلِ نخواستہ اٹھایا کہ شاید اس میں کچھ باتیں کام کی ہوں۔ مگر چند ہی صفحے پڑھنے کے بعد، اس خیال سے کہ کہیں حدیث پڑھتے پڑھتے اسلام ہی سے منحرف نہ ہو جاؤں، کتابیں لائبریری میں واپس بھیج دیں۔ دین کی سچائیوں اور گہرائیوں کی جستجو میں اسلام کی جو ارفع و اعلیٰ عمارت تخیل میں بنا رکھی تھی مسمار ہوتی ہوئی دکھائی دی۔ خدا کے آخری رسولؐ کی شخصیت ذہن میں گم صُم سی ہونے لگی۔ خاکم بدہن کیا محمدِ عربیؐ، زندگی کے اِنہی مسائل پر انسانوں سے گفتگو کیا کرتے تھے؟ دل و دماغ، پراگندہ سے ہونے لگے۔ غرض عجیب ذہنی الجھن اور کشمکش تھی کہ اِنہی دنوں ایک روز دورانِ گفتگو میں اپنی ایک دوست سے اس کا ذکر آیا تو کہنے لگیں "پرویز صاحب لاہور آئے ہیں، شاید وہ اِن مسائل کو حل کرنے میں مدد دیں۔" پوچھا "یہ پرویز صاحب کون ہیں۔؟" جواب ملا "بہت بڑے عالم ہیں، بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔"

آج مجھے تعجب ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر میں نے نہ پرویز صاحب کا نام سُنا تھا نہ ان کی کوئی تصنیف نظر سے گزری تھی۔ معلوم کیوں؟ شاید اپنی ہی کوتاہیٔ نظر اس کا بہانہ ہو۔ بہرحال، اسی دوست کی معرفت ایک کتاب پڑھنے کو ملی۔ نام تھا "اسبابِ زوالِ اُمّت"۔ کتاب مختصر سی تھی، ایک ہی نشست میں ختم کر ڈالی۔ اور پھر کتنی ہی دیر تک میں اور مس حمید خواجہ، پرویز صاحب کے تفکر کی گہرائی، اندازِ بیان کی دلکشی اور اس کے تاثرات پر گفتگو کرتی رہیں۔

تھوڑے ہی دنوں بعد پرویز صاحب لاہور تشریف لے آئے، اور سب سے پہلا خطبہ جو کانوں نے سُنا وہ تھا "قانونِ مکافاتِ عمل"۔ پرویز صاحب کی زبانی انسانوں کے عمل پر اللہ کے قانون کی حکمرانی بڑی ہی جاندار معلوم ہوئی۔ اور پھر جیسے جیسے خطبات کا سلسلہ آگے بڑھتا گیا، ذہن کے بند دریچے آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔ اور اسلام اپنی ذات سے ہٹ کر، قوم و ملک کی حدوں کو پار کرتا اور فضائے بسیط پر چھایا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پرویز صاحب نے ہمیں قرآن اور اسلام سے پیار کرنا سکھایا۔ اس کتابِ مقدس کو نئے انداز میں پڑھنا اور سمجھنا سکھایا۔ جھُوم جھُوم کر، رقت انگیزیوں کے ساتھ، تیز گام جیسی رفتار سے پڑھنے کی بجائے، اس کی ایک ایک آیت پر رُکنے اور غور کرنے کی ترغیب دی ـــــ مگر ـــــ یہ ترغیب دل کا رہا سہا سکون لُٹا سا گئی ہے۔ یہ سوچ کر بڑی ہی اضطرابی کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ اسلام اپنی اصلی اور پائدار شکل میں صرف اسی کتابِ مقدس میں باقی رہ گیا ہے۔ نہ مسلمانوں کے نام کے ساتھ چسپاں ہے۔ نہ ان کے اعمال و معاشرت سے وابستہ۔ نہ دنیا کی کسی سیاست میں اس کا رنگ جھلکتا ہے۔ اسلام نے فرد و معاشرے کو ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم قرار دیا۔ آج ہمارے پاس نہ ایسا معاشرہ ہے جو مؤمن پیدا کرے اور نہ ایسے افراد ہیں جو اسلامی معاشرہ کو متشکل کر کے دکھائیں۔ اور وہ چار دل جو اس تمنا میں تڑپتے ہیں، ایسی قوتیں کہاں سے لائیں کہ ہم اپنی زندگی میں نظامِ خداوندی کو محسوس شکل میں دیکھ سکیں ـــــ

ہمارا اپنا مقام کہاں ہے - ؟ کچھ سُجھائی نہیں دیتا ـــــ ہم نے پرویز صاحب کے خطبات سُنے ہیں۔ اُن کی تصانیف کا مطالعہ کیا ہے۔ دل میں کشادگی، نظر میں وسعت، خیال میں گہرائی۔ تخیل میں بلندی، تصورات میں نیا رنگ آیا ہے۔ مگر عملی اقدام [illegible] لوگ اتنے ناکارہ محض ہو چکے ہیں کہ زندگی میں کوئی حرکت [illegible] دیتی ـــــ دلیل اصل یہ ہے کہ باہر کی دنیا میں انقلاب لا[illegible] [illegible] ہونا ضروری ہوتا ہے۔ پرویز صاحب نے اِس اندرونی تغیر کی طرح ڈالی ہے، اور ہمارے کندھوں پر یہ بوجھ رکھ دیا ہے کہ ہم باہر کی دنیا میں انقلابِ عظیم پیدا کریں، ورنہ اگر ان تاثرات کو لئے ہوئے ہم زمین میں دفن ہو گئے تو نہ پرویز صاحب کے درس دینے کا کوئی نتیجہ برآمد ہوگا نہ ہمارے درس لینے کا ـــــ اور آنے والی نسلیں ہمیں اس کے لئے کبھی معاف نہ کر سکیں گی۔

ہمیں اپنا مقام خود متعین کرنا ہے کہ جس منزل کی جھلک دکھائی گئی ہے، اُس تک پہنچنے کے لئے ہمیں کس مقام اور کس رُخ سے قدم اُٹھانا ہوگا۔ تاآنکہ ہمارا ہر قدم ہمیں اُس منزل کے قریب تر لے جائے۔

ہم ہر سال کنونشن کے لئے جمع ہوتے ہیں، کتنا اچھا ہو، اگر ہم میں سے ہر شخص اس موقعہ پر اپنے کردار کا جائزہ لے اور دیکھے کہ اُس نے خود اپنے آپ کو کتنا مسلمان بنایا ہے۔ اور اگر ہم سب [illegible] [illegible] ہم [illegible] عظیم [illegible]

والسّلام

بقیہ "عورت کی مظلومی کے اسباب" صفحہ ۔ سے آگے

سطح پر پہنچ کر یہ جماعتی تفریق حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہے۔ مرد و عورت میں بھی فقط ان کی حیاتیاتی ساخت اور اُن کے فرائض کی تمیز باقی رہتی ہے اور بس ـــــ اس تفریق کی بنا پر انہیں مختلف عادات و خصوصیات کا حامل قرار دینا مضحکہ خیز ہے۔

جہاں تک جنسی میلانات کا تعلق ہے، قرآن اِنہیں شرمناک قرار دیکر انسان کو نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا نہیں کرتا۔ بلکہ مستقل اقدار سے ان کی رہبری کرتا ہے اور انھیں ان کا جائز مقام دیتا ہے۔ ایسا معاشرہ جس کی تشکیل قرآن کے کھینچے ہوئے خطوط کے مطابق کی گئی ہو، عورت کو فتنہ نہیں قرار دیتا۔ اور نہ ہی اُسے مرد کی حیوانی خواہشات کی تسکین کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے۔ وہ فطرت کے نقشے کے مطابق دونوں کو مختلف فرائض سونپتا ہے، اور اس طرح انہیں ایک دوسرے کی اعانت اور تکمیلِ ذات کے لئے لازم و ملزوم بنا دیتا ہے۔

اس معاشرے کو قائم کرنے کے لئے عورتوں کی جانب سے خاص طور پر ہر ممکن تعاون کی ضرورت ہے، کیونکہ اسی میں ان کی تمام مشکلات کا حل اور ان کی انسانیت اور شخصیت کے تحفظ کا راز پوشیدہ ہے۔

والسّلام

(ترجمہ پروفیسر زاہدہ منظور)

عائلی قوانین

محترمہ حمیدہ جہاں صاحبہ۔ وائس پرنسپل لیڈی میکلیگن کالج - لاہور

ہر شخص، خواہ غریب ہو یا امیر، اعلیٰ شخصیت کا مالک ہو یا مجرم، کسی نہ کسی گھر یا خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ آج کا شخص، اس وقت کی پیداوار نہیں، بلکہ اتنے ہی سال پرانی بات ہے جتنی اس کی عمر۔ ہم جب کسی مجرم یا غیر متوازن شخصیت کو دیکھتے ہیں تو کلیتہً ذمہ داری اس پر رکھ دیتے ہیں اور جس گھر میں وہ پیدا ہوا تھا اور جن ہاتھوں سے اس کی پرورش ہوئی تھی نگاہیں وہاں تک نہیں پہنچتیں۔ اگر ہم پچھلی کڑیوں کا سُراغ لگائیں تو افراد کی کمزوری اور معاشرہ کی خرابیاں گھروں اور خاندانوں میں پلتی ہوئی دکھائی دیں گی۔ اس لئے ایک گھر اور خاندان کی زندگی، اس کا ماحول اور اس کا استحکام نہایت ضروری ہے۔

وہ گھر جہاں انسان پیدا ہوتا ہے۔ جہاں اُس کی پرورش ہوتی ہے اور تربیت کی عمارت کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اس کے اصول اور قوانین کی بنیاد، انفرادی خوشی اور پسند، یا "ہزاروں سال سے یونہی کرتے آئے ہیں" کی اساس ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کوئی یہ کیوں نہیں سوچتا کہ وہ بزرگ اور وہ حالات بھی تو لاؤ جنھوں نے وہ دستور اُس وقت بنائے تھے۔ اس سوال کے ساتھ سوائے اس جواب کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ مذہب بھی تو یہی کہتا ہے۔ اور اس مذہب کی آڑ میں لوگ اپنے فرسودہ دستوروں اور بے جان روایات کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کو مذہب کہتے ہیں۔ اور پھر اس پر جنت کے حصول کا دعوٰے قائم کرتے ہیں۔

فرد کی پیدائش، پرورش، تعلیم کی ضرورت کے تحت خاندانی زندگی کا قیام اور اس میں امن و سلامتی ضروری ہے ان مقاصد کے حصول کے لئے ایسے اصول اور قوانین کی ضرورت پیدا ہوتی ہے، جن سے خاندان کے افراد اپنے حقوق کی حفاظت اور فرائض کی ادائیگی سے باخبر ہو سکیں۔ کوئی بھی گھر یا معاشرہ، امن و سلامتی کا گہوارہ نہیں بن سکتا۔ جہاں فرد کو یہ یقین نہ ہو کہ اس کا حق اُسے مل جائے گا اور وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے اور وہ خود دوسرے کی حق تلفی نہیں کرے گا۔ اس وقت تک جو عائلی قوانین رائج ہیں وہ کچھ "ایسا ہوتا آیا ہے" کی پیداوار ہیں۔ نہ تو کبھی ان کا جائزہ لیا گیا اور نہ ہی یہ معلوم کیا گیا کہ موجودہ دستور اور رواج کے بموجب ہماری گھریلو زندگیاں کیسے ناہموار اور نامناسب نتائج بروئے کار لا رہی ہیں۔ اس قسم کا جائزہ لینے کی جرأت کون کرتا۔ کیونکہ عائلی زندگی اور اس سے متعلقہ قوانین اُس دَور کی حکومت یا نظام کی دلچسپی کا سبب نہ تھے۔ پاکستان کے قیام سے پیشتر حکومت کو ان چیزوں سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ چنانچہ جو کچھ ہو رہا تھا وہ شخصی ذمہ داری اور روایات تک محدود تھا۔

قیامِ پاکستان کے بعد پہلی مرتبہ اس ضرورت کا احساس ہوا کہ ان عائلی قوانین کی طرف توجہ دی جائے، جو رائج الوقت

تھے اور اُن پر نظرِ ثانی کی جائے۔ ۱۹۵۵ء میں عائلی کمیشن، زیرِ صدارت خلیفہ شجاع الدین مرحوم مقرر ہوا تھا۔ اور اس نے اپنی سفارشات ۱۹۵۶ء میں پیش کر دی تھیں۔ لیکن ان پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ اب موجودہ حکومت کے دیگر تعمیری اقدامات میں سے ایک قدم یہ بھی تھا کہ ۳۰ مارچ ۱۹۶۱ء کو عائلی قوانین کی سفارشات کو منظور کیا گیا۔ اور یہ اعلان ہوا کہ تین ماہ بعد ان پر عمل درآمد شروع ہو جائے گا۔

ان سفارشات میں ایک عام اور قابلِ قبول چیز یہ ہے کہ ہر شادی رجسٹر میں درج ہوگی اور نکاح پڑھانے والا شخص وہ ہوگا جس کے پاس اس کا لائسنس ہو۔ ان حالات میں جب دوسرا شخص نکاح کا فرض ادا کرے گا تب بھی شادی کا اندراج ضروری ہوگا۔ اس ترمیم پر تو شاید کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا لیکن اس سے یہ فرض ضرور عائد ہوتا ہے کہ ہمارے عوام میں سے ہر ایک کے سامنے ایک معاہدہ کو تحریری شکل دینے کے لئے لکھنے پڑھنے کی اہمیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ خاص طور پر اس معاشرہ میں جہاں خواندگی صرف ۱۵ فیصد ہو۔ اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہمارے کچھ ناخواندہ افراد کو اس میں دقت پیش آئے اور اسکو بخوشی و رغبت اختیار کرنے کے بجائے وہ گریز کی راہیں نکالیں۔ بہرحال یہ قانون اپنی اہمیت اور قوت رکھتا ہے۔

دوسری سب سے بڑی ترمیم، جو نہایت توجہ طلب اور دلچسپ ہے، وہ مسئلۂ تعددِ ازدواج ہے۔ اس وقت تک یہ بات عام تھی کہ ایک وقت میں ایک مرد، ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اس نکتۂ نظر کو یوں تقویت دی جاتی تھی کہ مرد طاقتور ہوتا ہے، کماتا ہے، اور قرآن نے اس کو یہ حق دیا ہے۔ بھلا جسمانی طاقت کی بنا پر برتری کا اظہار، اور اسی برتری کو ظاہر کرنے کے لئے ایک سے زائد بیویاں رکھنے کا حق، کن دلائل اور نکات سے ثابت ہوتا ہے۔ آخر اس کی دلیل کیا ہے کہ جو طاقتور ہے وہ برتر ہے یا جو زیادہ زوج رکھ سکتا ہے۔ وہ اعلیٰ اور افضل ہے۔ حیوانی سطح پر یہ باتیں شاید اہم قرار دی جا سکتی ہوں، لیکن انسانی درجہ پر برتری کا معیار یہ نہیں، وہ تو صرف ایک ہی معیار ہے، یعنی اعلیٰ کردار یا تقویٰ شعاری۔ بلند کردار شخص وہی ہے جو اپنا حق حاصل کرتا ہے۔ اور دوسرے کے حق کی حفاظت کرتا ہے۔ اور یوں اپنے ہر خیال اور عمل میں انصاف کو قائم رکھتا ہے۔ انہی اصولوں کی بنا پر قرآن نے مرنے کے بعد بھی اقتصادی ذمہ داری کا بوجھ رکھتا ہے۔ یعنی پرورشِ نسل کی ذمہ داری اور وہ بھی انصاف کے ساتھ۔ سورۂ نساء (آیت ۳) میں جہاں ایک سے زائد ازدواج کا ذکر ہے وہاں اس سے پہلے یتامیٰ کی پرورش اور ان کے مال کی حفاظت کا ذکر ہے۔ اوّل اہمیت یتامیٰ کی پرورش اور ان کی حفاظت کو دی گئی ہے۔ اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے یہ حل پیش کیا گیا کہ دو دو اور تین تین بیویاں کر لو۔ لیکن اس کے بعد پھر وہی انصاف کا سوال اہم ہے اور یہ کہہ دیا کہ تم اس حالت میں انصاف نہیں کر سکو گے، اس لئے ایک ہی کی ذمہ داری کو اُٹھانا بہتر ہے۔ اس سورۃ کی دوسری اور تیسری آیت سے مرد کی خاندانی زندگی میں جو ذمہ داریاں ہیں انھیں اُبھار کر سامنے لایا گیا ہے۔ اور اسے حاصل کرنے کیلئے چند طریقے پیش کئے گئے ہیں۔ دو یا تین بیویوں کی اجازت، نفسی یا جنسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے نہیں دی گئی اور نہ ہی اسکا کوئی ذکر ہے۔ بلکہ جنسی اور نفسیاتی ضرورت کے تحت ایسا کیا جائے تو وہ شخص نفسیاتی طور پر ایک صحت مند کردار کا مالک

نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ ان حالات میں حق و انصاف قائم نہیں رکھ سکتا جن کا وہ نگران اور سرپرست ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔

موجودہ زمانہ میں جبکہ زندگی کی ضروریات سائنٹفک ایجادات کے سبب پیچیدہ اور وسیع ہوتی جا رہی ہیں تو آنے والی نسل کی پرورش۔ تربیت اور تعلیم بھی مشکل تر ہوتی جا رہی ہے۔ پیدائش۔ پرورش اور تعلیم کی ذمہ داری والدین پر ہے۔ اور وہ بغیر تعلیم کے اس ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتے۔ انسانی پرورش کا زمانہ طول طویل ہوتا ہے۔ کیونکہ انسانی بچہ کی پرورش اور تربیت کا زمانہ حیوانی بچہ کی طرح مختصر نہیں ہوتا۔ ابتدائی زمانہ پیدائش سے چھ سال تک، پھر چھ سے بارہ سال تک، عہدِ طفلی کا زمانہ، پھر بارہ سے سولہ سال تک حصولِ بلوغیت کا زمانہ۔ یہ سب تربیت و تعلیم کا متقاضی ہے۔ اس کے بغیر انسانی بچہ صحیح راہ اختیار نہیں کر سکتا۔ یوں تو تعلیم و تربیت کی ضرورت کبھی ختم نہیں ہوتی بلکہ ساری زندگی جاری رہنی چاہیئے۔ اور اب جبکہ زندگی کے ہر معاملہ میں تیز رفتاری اس قدر آ چکی ہے کہ اگر انسان کھڑے ہو کر سستانے کا خیال بھی کرے تو پس ماندگی کے اندھیرے میں جا گرتا ہے۔ آج کا زمانہ تقاضا کرتا ہے کہ ہر فرد کمربستہ کھڑا ہو۔ آنکھیں کھلی ہوں۔ کان مستعد ہوں۔ تمام حواس پورے طور پر تربیت یافتہ ہوں اور دماغ سے تعاون کرتے ہوئے زندگی کو آگے بڑھاتے چلیں۔ بچہ کی پرورش اور تربیت کے لئے ہمیں ایک گھر اور اس میں ہموار اور مستحکم ماحول کی ضرورت ہے۔ جو اسی صورت میں میسر آ سکتا ہے جبکہ اس کے قائم کرنے والوں کے حقوق کی حفاظت ہو اور وہ اپنے فرائض سے آگاہ ہوں۔

قابلِ ستائش اور امید افزا بات جو عائلی کمیشن نے پیش کی ہے وہ تعددِ ازدواج کے بارے میں شرائط اور پابندیاں ہیں۔ اور یہ شرائط خاندان کی زندگی کو بہتر، خوشگوار اور مستحکم بنانے کے لئے ہیں۔ عائلی قوانین قرآنی روشنی میں مرتب کرنے کا حکومت کی طرف سے یہ پہلا قدم ہے۔ اور اس کے نافذ ہونے کے بعد جو خوش آئند نتائج نکلیں گے وہ آئندہ سب کے سامنے آئیں گے۔

عائلی قوانین بنانے اور نافذ کرنے کا مقصد عائلی زندگی میں پختگیٔ عمل اور سلامتی پیدا کرنا ہے۔ مردوں کی آزادی یا ان کی حق تلفی نہیں۔ نہ ہی ان کے حقوق کو غصب کر کے عورتوں کے سپرد کرنا، بلکہ مردوں کو ان کی ذمہ داریوں اور فرائض سے آگاہ کرنا اور عورتوں کو ان کے چھنے ہوئے حقوق واپس دینا۔ اور ان کے فرائض سے روشناس کرانا ہے۔ یہ اس راہ کی پہلی داغ بیل ہے معاشرہ میں جسمانی اور دماغی طور پر متوازن شخصیتوں کا ظہور، گھر کے توازن کے استحکام اور سکون پر ہوتا ہے۔ اگر ہمیں اچھے لوگوں کی ضرورت ہے۔ اور ہم ایسا اسلامی معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جس میں ہر شخص کی پوری پوری نشوونما ہو اور کبھی بھی کسی شخص کو یہ اندیشہ نہ ہو کہ اس کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ جہاں کوئی شخص اپنی ذاتی اغراض اور احساسِ برتری کے لئے دوسروں کی حق تلفی پر مائل نہ ہو سکے۔ تو ہمیں کم سے کم پچاس سال پہلے اپنے گھروں اور خاندانی زندگی کو یوں مرتب کرنا پڑے گا کہ فرد اپنے حق و فرائض سے باخبر ہو، اور اس پر عمل کرنا جانتا ہے۔

دو مختلف احوال سے متعلق افراد جب یکجا ہو کر گھر قائم کرتے ہیں تو اس میں ہر قسم کی دقتوں اور مشکلات کا سامنا ہوتا ہے

طبائع کا اختلاف، اقتصادی اختلاف، خیالات و نظریات کا اختلاف۔ یہ سب چیزیں اتنی آسان نہیں کہ ان کو ایکدم اتحاد میں بدل لیا جائے یا نظر انداز کر دیا جائے۔ یا ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کر لیا جائے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نظریات کے اختلاف کی بناء پر یکجا رہنا ناممکن ہو جاتا ہے، اسی قسم کی وہ وجوہات بھی ہو سکتی ہیں جن کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے بجائے اُن سے دُوری اور کنارہ کشی اختیار کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اور اسی بناء پر ازدواجی زندگی میں طلاق کے اختیارات موجود ہیں۔

جب دو شخصیتوں کا یکجا رہنا ناممکن ہو جائے تو انھیں الگ ہونے کا حق ہے۔ لیکن اس حالت میں بھی کسی فریق کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیئے۔ اور یہ اس وقت ممکن ہے جب علیحدگی کا خیال، ارادہ اور عمل، عقل و فہم کے تحت ہو۔ غصہ، اشتعال بدلہ، بغض و حسد کے تحت گھر کو تباہ نہ کیا جائے۔ کیونکہ جب یہ حالت انسان پر طاری ہوتی ہے تو وہ اس وقت نہ اپنے حقوق کا جائزہ لیتا ہے اور نہ اپنے فرائض پر نگاہ ڈالتا ہے۔ چنانچہ ان عائلی قوانین میں طلاق کو عملی جامہ پہنانے کا وہ طریق کار اختیار کیا گیا ہے جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی غصہ کی حالت نہ ہو۔ رنج اور انتقام نہ ہو۔ اور ثالث اس صورت میں ہر دو فریق کی علیحدگی کو حسن کارانہ طریقہ پر انجام دینے کی کوشش کرے۔ ثالث بھی ایسا ہو جو دونوں فریق میں صلح کرانے کی جانب رجوع کرے۔ اور جب یہ ممکن نہ ہو تو پھر طلاق اس طریقہ سے تکمیل پائے کہ عورت کو اپنا حق مل جائے اور بچوں کے حقوق اور تربیت کا بھی انتظام ہو جائے۔ اس کی مدت کو بھی لمبا کیا ہے کہ بہتر اور اچھی صورت پیدا ہو سکے۔ مثلاً طلاق تین ماہ بعد بصورتِ حمل، بعد پیدائشِ بچہ کے عمل میں آئے۔

ان اصول اور قوانین کے مرتب کرنے میں یہ مقصد نہیں کہ کچھ حقوق مرد سے لیکر عورت کو دیدیے جائیں، یا اس کی آزادی کو ختم کر دیا جائے۔ بلکہ مقصد ظلم اور زیادتی کو ختم کرنا، اور حق کا قائم کرنا ہے، تاکہ فریقین کے دلوں سے بے اعتمادی کو دُور کر دیا جائے اور آنے والی نسل کی صحیح اور بہتر پرورش ہو سکے۔

آنے والی نسل کی پیدائش، پرورش اور تربیت کا کام ایسا آسان اور سیدھا سادہ نہیں کہ ایک کمسن لڑکی بغیر تربیت اور تعلیم کے انجام دے سکے۔ یہ تو صرف حیوانی سطح کا تقاضا ہے کہ ایک ۱۴ سال کی لڑکی بلا تعلیم و تربیت ازدواجی زندگی کے فرائض کو پورا کر سکے۔ پیدائش کے ساتھ پرورش اور تربیت کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ جس کے لئے مناسب عمر اور تعلیم کی ضرورت ہے۔ جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے، ہمارے مُلک میں شاید آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ بہرحال پاکستان بننے کے بعد اس کی ضرورت کا احساس اور صحیح راہ پر قدم اٹھانا بھی ایک بڑی امید افزا تحریک ہے۔ کیونکہ پاکستان کا مقصد اسلامی معاشرہ کی تشکیل اور اس کا قیام ہے۔ چنانچہ ان قوانین میں یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ شادی کے وقت لڑکی کی کم سے کم عمر ۱۴ سال کے بجائے ۱۶ سال ہونی چاہیئے۔

عائلی اصول و قوانین میں اس بات پر زور دیا جانا چاہیئے کہ انسانی بچہ کی پرورش اور تحفظ کا پورا پورا انتظام کیا جائے۔ اس

کے تحت شادی کا معاہدہ خاندانی زندگی کا قیام اور طلاق کا طریق، یہ سب وہ امور ہیں، جن سے ہر ایک کے حق کی حفاظت ہو۔ پھر بھلا یہ کیسے قبول کیا جا سکتا ہے کہ ایسے بچے، جن کے والد کا انتقال ہو چکا ہو اور ان کو جو حقوق اپنے دادا سے ملنے تھے ہوں، اُن سے محروم کر دیا جائے، اور اس پر ظلم یہ کہ اس طریق کو قرآن کی تعلیم سے منسلک کر دیا جائے۔ یہ کس قدر قابلِ تحسین و تشکر ہے کہ عائلی کمیشن نے اس نقصان دہ دستور کو ختم کر کے یتیم پوتے کو اپنے دادا سے اس کا حق دلوا دیا ہے۔

ان قوانین کے نفاذ کے بعد اس چیز کی ضرورت ہے کہ عوام کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ وہ ان پر پورا پورا عمل کریں۔ اور اس سے جو خوشگوار نتائج برآمد ہوں ان کا جائزہ لیا جائے، اور اس کے بعد پھر جن ترمیموں کی ضرورت ہو، ان کو حالات کے مطابق ترتیب دیا جائے۔ یہ اسلامی معاشرہ کی ابتدا ہے، جس کو ہماری روشن ضمیری قرآن کے اوراق میں بخوبی دیکھ اور سمجھ رہی ہے۔ اس سے بجا طور پر یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ ہمارا معاشرہ سکون، خوشحالی اور انسانیت ساز رجحانات کا گہوارہ بن جائے گا۔ اور رفتہ رفتہ ہم اُس منزل تک جا پہنچیں گے جسے ہمارے لئے ہمارے خدا نے مقرر کیا ہے۔

والسّلام۔

بقیہ "بچوں کی تربیت و تعلیم کی اہمیت" صفحہ ۱۰۱ سے آگے

ضبط کے ساتھ کیجائے تو وہ اس پابندی کی حقیقت سے آشنا ہو کر کبھی بھی اس کے خلاف نہ ہونگی۔

بچوں کی تربیت عمر کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ موجودہ زمانہ بڑا ہی پرشور گذر رہا ہے۔ آزادی کی لہر ہر فرد میں ہے۔ والدین کی مشکلات بڑھتی جا رہی ہیں ہمارے بچے ذہنی طور پر اُس سطح سے بلند ہیں، جو ہماری تھی۔ زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے، اگر ہم نے اسی برق رفتاری سے زمانہ کا ساتھ نہ دیا تو ہم پیچھے رہ جائیں گے۔ ہمیں اپنے بچوں کی ذہنی ترقی اور نشوونما میں ان کی نگرانی، رہنمائی اور مدد ہر حال میں کرنی ہے۔ ان کے مسائل کا حل بھی ہم ہی انہیں بتا سکتے ہیں۔ یاد رکھئے! ہمارا فرض صرف جسمانی پرورش کے ساتھ ختم نہیں ہوتا۔ ذہنی ارتقاء، پاکیزہ سیرت اور بلند اقدار کی حامل قوم ہی صرف عبد مومن کا مقام حاصل کر سکتی ہے اور وہی خلافتِ ارض کے قابل بنتی ہے۔ ہمارے لئے ضابطۂ حیات قرآن کریم ہے اور مبارک ہیں وہ مائیں جو قرآنِ کریم کی صداقت اور عظمت کو اپنے بچوں کے قلوب میں جاگزیں کر دیں اور ان کے بچے علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھیں کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اور پھر ان کے یقین محکم اور عمل پیہم سے یہ عالم جگمگا اُٹھے اور یہ فرمان باری تعالیٰ پورا ہو جائے کہ

واشرقت الارض بنور ربّھا

بقیہ "ڈاکٹر کی مشکلات" صفحہ ۱۳ سے آگے

معاشرہ کے سر ہو۔ نہ بیماروں کو اپنے علاج کے لئے کچھ دینا پڑے، نہ ڈاکٹروں کو اپنی ضروریات کے لئے اُن سے کچھ لینا پڑے۔ (اسی کا نام قرآنی نظام ربوبیت ہے)۔

یہ ہے، میری عزیز بہنو، بھائیو اور بزرگو، میرے خیال میں ان مشکلات کا حل۔ شاید آپ بھی اس سے متفق ہوں۔

والسّلام۔

ہر روز ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ

مفہوم القرآن کب شائع ہوگا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب آپ چاہیں گے۔!

وہ کس طرح۔؟

اس طرح کہ مفہوم القرآن ایک بہت بڑا پراجیکٹ ہے۔ جسے جب ہاتھ میں لیا گیا تو اُسے مکمل کئے بغیر رکھا نہیں جائے گا۔ اس لئے اس کے متعلق پروگرام یہ ہے کہ آپ حضرات مبلغ دس روپے پیشگی جمع کرا کر اپنا نام فہرست خریداران میں درج کرالیں۔ مفہوم القرآن کا ہر پارہ آپ کو بلا محصول ڈاک گھر بیٹھے ملتا جائے گا۔

لیکن اس کی طباعت اس وقت شروع ہوگی جب کافی تعداد میں خریدار اپنا نام درج فہرست کرالینگے۔

لہٰذا

اگر آپ چاہتے ہیں کہ مفہوم القرآن جلد چھپ کر آپ کے پاس پہنچ جائے تو

اپنا نام بھی درج فہرست کرالیں

اور اپنے احباب سے بھی کہیں کہ وہ اپنے نام فہرست خریداران میں درج کرالیں۔

اب دیر آپ کی طرف سے ہے۔ ہماری طرف سے نہیں

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔بی شاہ عالم مارکیٹ لاہور

باب المراسلات

رویتِ ہلال

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ مُلک میں رویتِ ہلال کے مسئلے نے خاصی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ آپ اس کے متعلق ذرا تفصیل سے لکھیں۔ اس ضمن میں ماہنامہ ترجمان القرآن کی اپریل ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں ایک مستفسر کے سوال کے جواب میں جو کچھ لکھا گیا ہے اُسے درجِ ذیل کیا جاتا ہے:-

"عید کے موقعہ پر رویتِ ہلال کے سلسلہ میں جو گڑبڑ ہوئی ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی پاکستان میں کئی بار یہ صورت رُونما ہو چکی ہے۔ اور اس سے عام مسلمانوں میں بڑی پریشانی پیدا ہوتی رہی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان قائم ہونے سے پہلے متحدہ ہند میں کبھی اس طرح انتشار برپا نہیں ہوا تھا۔ اب اگر حکومت اور علماء باہمی تعاون سے کام کریں تو اس انتشار کو بآسانی رفع کیا جا سکتا ہے۔ میرے نزدیک اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ پاکستان کے ہر ضلع میں، دو عالم ایسے مقرر کئے جائیں جن کا اپنے علاقہ میں بھی اعتماد ہو اور ان کے ضلع سے باہر بھی لوگ اُن کو جانتے ہوں اور اُن پر اعتماد رکھتے ہوں۔ اسی طرح ڈھاکہ، کراچی اور لاہور میں پانچ پانچ علماء کی ایک مجلس مقرر کر دی جائے۔ جو عام طور پر مُلک میں قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہوں۔ حکومت کی طرف سے، اضلاع کے علماء کو یہ سہولت بہم پہنچائی جائے کہ اپنے شہر سے مذکورۂ بالا تینوں مراکز میں سے کسی ایک مرکز پر وہ بذریعہ ٹیلیفون ہلال کے دیکھے جانے یا نہ دیکھے جانے کی اطلاع رات کے نو بجے تک پہنچا دیں۔ ان تینوں مراکز کے علماء ان اطلاعات کی بناء پر، اور خود اپنے شہر اور آس پاس کے علاقوں کی اطلاع کی بنا پر فیصلہ کریں کہ چاند ہوا ہے یا نہیں ہوا ہے۔ نیز یہ تینوں مراکز باہم ٹیلیفون پر اپنی اطلاعات کا تبادلہ بھی کریں، اور پھر ان تینوں مرکزوں میں سے کسی ایک مرکز سے آخری فیصلہ ریڈیو پر کوئی عالم نشر کرے۔ اور وہ ایسا عالم ہونا چاہیئے جس کی آواز بالعموم ملک میں پہچانی جاتی ہو۔ مثلاً مفتی محمد شفیع صاحب، جن کی آواز ملک میں لاکھوں آدمی پہچانتے ہیں۔ یا اور کوئی دوسرا شخص، جس کی آواز پہچاننے والے مُلک میں ہزاروں لاکھوں آدمی موجود ہوں۔ ریڈیو پر اطلاع ایک وقتِ معیّن میں نشر ہونی چاہیئے۔ مثلاً رات کے دس بجے۔ اور پہلے سے یہ چیز ملک میں معلوم ہونی چاہیئے کہ

فلاں وقتِ مقررہ پر ریڈیو سے چاند کا اعلان ہوگا۔ اس طرح آسانی سے انتشار ختم کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلیفون پر بالعموم آواز پہچانی جاتی ہے۔ اگر کوئی معتبر عالم اطلاع دیں گے تو وہ بھروسے کے قابل ہوگی۔ اس طرح ریڈیو پر بھی آواز پہچانی جاتی ہے۔ مُلک کے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے یہ صورت بھی اختیار کی جا سکتی ہے کہ دو تین علماء باری باری بیان نشر کریں۔ لوگ ان کی آواز پہچانیں گے اور ان کے قول پر اعتماد کریں گے۔

بہرحال اس ملک کے باشندے دینی معاملات میں جو اعتماد علماء پر رکھتے ہیں، وہ کسی اور پر نہیں رکھتے برسرِ اقتدار لوگوں کو "مُلّا" سے جو بھی نفرت ہے۔ ہوا کرے۔ مگر دینی معاملات میں عام مسلمان بہرحال "مُلّا" ہی پر بھروسہ رکھتا ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ ریڈیو پر کوئی خاتون خبریں سُناتے ہوئے چاند ہونے کی اطلاع دیں اور ان کے ارشاد پر ملک میں روزے رکھے اور توڑے جائیں۔ جن لوگوں کو اس ملک میں حکومت کرنی ہے، انھیں اپنی قوم کے مزاج اور اس کی روایات کا لحاظ کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ بجز اس کے کہ کشمکش پیدا ہو، اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

طلوعِ اسلام جیسا کہ ہم نے طلوعِ اسلام کی اپریل کی اشاعت میں لکھا تھا، رویتِ ہلال کے مسئلہ کو نہ شریعت سے کوئی تعلق ہے، نہ دین سے کچھ واسطہ۔ مولوی صاحبان نے اسے جو اہمیت دی ہے اُس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اپنے اس اقتدار (AUTHORITY) کو کسی نہ کسی طرح قائم رکھنا چاہتے ہیں، جو انھیں سیکولر حکومتوں کے زمانہ میں حاصل رہا ہے۔ آپ نے ترجمان القرآن کا جو اقتباس نقل فرمایا ہے، وہ اس کی زندہ شہادت ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ریڈیو پاکستان کسی پرائیویٹ فرم کے کنٹرول میں نہیں کہ جس سے نشر شدہ خبروں کی ذمہ داری قابلِ اعتماد نہ ہو۔ یہ ریڈیو براہِ راست مرکزی حکومت کے کنٹرول میں ہے اور اس سے نشر شدہ ایک ایک لفظ کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی موجودگی میں یہ کہنا کہ

"یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ریڈیو پر کوئی خاتون خبریں سُناتے ہوئے چاند ہونے کی اطلاع دیں اور ان کے ارشاد پر ملک میں روزے رکھے اور توڑے جائیں۔"

درحقیقت اس امر کا اعلان ہے کہ حکومت کی طرف سے نشر کردہ اعلان قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس اگر مفتی محمد شفیع صاحب اعلان فرمائیں تو اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اصل سوال حکومت اور مولوی کے اعتماد اور اقتدار کا ہے۔ اور اس باب میں مولوی کا فیصلہ یہ ہے کہ:۔

"دینی معاملات میں عام مسلمان بہرحال "مُلّا" ہی پر بھروسہ رکھتا ہے۔"

مُلّا کی چال بڑی دُور رس ہے۔ رویتِ ہلال کی تو یونہی آڑ لی گئی ہے۔ اس کی بساطِ سیاست کے مہروں کی پوزیشن یہ ہے:۔

(۱)۔ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں۔

(۲)۔ اسلامی قوانین کا تعلق دینی معاملات سے ہوتا ہے، کیونکہ اسلام میں دین اور دنیا الگ الگ شعبے ہیں۔
(۳)۔ دینی معاملات میں عوام بہرحال مولوی پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس لئے
(۴)۔ ملک میں اسی قانون کو اعتماد حاصل ہوگا جس کی تائید مُلّا کرے گا۔ بالفاظِ دیگر
(۵)۔ قانون سازی میں آخری اتھارٹی مُلّا کی ہونی چاہیئے۔

یہ ہے وہ مقصد جس کے لئے "رویتِ ہلال" کی آڑ میں یہ مُہرے رکھے جارہے ہیں۔ یہ بعینہ وہ پوزیشن ہے، جسے پہلی مجلس قانون ساز کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ میں داخل کیا گیا تھا۔ یعنی ایک "علما ربورڈ" کی تشکیل جس کی تائید و تصویب سے ملک میں قوانین نافذ ہوں۔ اور یوں مملکت کا عملی اقتدار ان حضرات کے ہاتھوں میں رہے۔ اسی کے لئے اب پھر یہ شور و شغب شروع کر دیا گیا ہے۔

"رویتِ ہلال" سے مقصد صرف یہ متعین کرنا ہے کہ چاند ہوا ہے یا نہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے طریقہ کیا اختیار کیا جائے، اس سے بھلا دین کو کیا تعلق ہے؟ اگر کسی ملک میں سائنٹفک آلات موجود ہوں تو اس امر کا تعین اُن کے ذریعہ کیا جاسکتا ہے۔ اگر ایسے آلات موجود نہ ہوں تو پھر آنکھوں سے دیکھنے کا طریق، یا دوسرے مقامات سے اطلاعات حاصل کرنے کے ذرائع کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو ملک کسی نظم و نسق کے ماتحت تمدنی زندگی بسر کر رہا ہو، وہاں یہ طریق، کسی نظم کے ماتحت اختیار کیا جائے گا۔ اس کے لئے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد مشینری حکومت کی ہوسکتی ہے۔ اب سوچیئے کہ اس میں علماٴ حضرات کہاں آتے ہیں اور ان کے فتاوی کی کہاں ضرورت پڑتی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ شہادت کے قابلِ قبول ہونے کیلئے علماٴ کے فتویٰ کی ضرورت ہے۔ قرآنِ کریم نے شاھد (گواہ) کے لئے صرف "صاحبِ عدل" ہونے کی شرط عائد کی ہے، اور اس باب میں، اس کی وسعتِ نظر کا یہ عالم ہے کہ وہ غیر مسلموں کی شہادت تک کو قابلِ قبول قرار دیتا ہے۔ (۵/۱۰۶) لیکن مولوی صاحبان ہیں کہ اس کے لئے ڈاڑھی تک کی شرط بھی لاینفک قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس شرط کی رُو سے، اور تو اور، مملکتِ پاکستان کے صدر، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب کی شہادت بھی قابلِ قبول نہیں قرار پاسکتی۔ جس مملکت کا صدر بھی (مولوی صاحبان کے فتویٰ کی رُو سے) معتبر گواہ نہ قرار پائے، اس مملکت کا خدا حافظ! پھر کیا یہ چیز بھی مضحکہ خیز نہیں کہ قتل کے مقدمہ میں تو ایک شخص کی شہادت قابلِ اعتماد قرار دی جائے اور چاند دیکھنے کے معاملہ میں اُسے ساقط الاعتبار سمجھا جائے؟

مندرجہ بالا اقتباس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:۔

"اس ملک کے باشندے دینی معاملات میں جو اعتماد علماء پر رکھتے ہیں وہ کسی اور پر نہیں رکھتے۔"

علماٴ کے پاس اپنے پراپیگنڈے کی مشینری اس قدر زبردست ہے کہ اس کا مقابلہ حکومت کے پراپیگنڈے کے ذرائع بھی نہیں کر سکتے۔ ان کی مشینری کا ایک جال ہے جو مسجدوں اور مکتبوں کی شکل میں ملک کے طول و عرض میں بچھا ہوا ہے۔

پراپیگنڈہ کے ان مراکز سے صبح، شام، دن، رات، اُٹھتے بیٹھتے، لوگوں کے کان میں یہ آواز ڈالی جاتی ہے کہ خدا اور رسول کے صحیح نمائندے مولوی صاحبان ہیں۔ اور کسی غیر مولوی کو حق حاصل نہیں کہ وہ امورِ شریعت میں لب کشائی کر سکے۔ اس طرح منظم اور مسلسل پراپیگنڈے سے یہ حضرات لوگوں کے دل میں اپنی بات نقش کر دیتے ہیں اور اس کے بعد اسی چیز کو اپنی تائید میں لطور ثبوت پیش کر دیتے ہیں (کہ دیکھئے، عوام کا اعتماد کس پر ہے!)

بہرحال، جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے، اس وقت پاکستان ایک نازک دوراہے پر کھڑا ہے۔ قدامت پرست طبقہ کی انتہائی کوشش یہ ہے کہ دینی معاملات اور دنیاوی امور کی اُس تفریق کو علیٰ حالہ رکھا جائے جسے اسلام مٹانے کیلئے آیا تھا، تاکہ ملک کی حکومت کے ساتھ ساتھ ان حضرات کی متوازی حکومت قائم رہے۔ جو لوگ پاکستان کو صحیح اسلامی حکومت کی تجربہ گاہ دیکھنا چاہتے ہیں، اُن کی خواہش یہ ہے کہ یہاں خلافتِ راشدہ کے اصولوں پر حکومت قائم ہو جائے، جس میں دینی اور دنیاوی امور میں کوئی تفریق نہ تھی، اور نہ ہی علماء حضرات کا کوئی الگ گروہ تھا۔ تمام امور کے فیصلے کتاب اللہ کی روشنی میں، حکومت کی طرف سے ہوتے تھے اور انہی کا نام قوانین شریعت تھا۔ اس وقت دنیا کی نگاہیں پاکستان کی طرف لگ رہی ہیں۔ اگر اس میں صحیح اسلامی نظام قائم ہو گیا تو دنیا میں اسلام کو بلند ترین مقام حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اگر یہاں (خدانخواستہ) قدامت پرستی کا دَور دورہ رہا تو، باقی دنیا تو ایک طرف خود پاکستان میں بھی اسلام کا کوئی مستقبل نہیں ہوگا۔ اب زمانہ زیادہ عرصہ تک قدامت پرستی کی زنجیروں کو گلے کا ہار بنائے رکھنے کیلئے تیار نہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ دیگا، اور چونکہ اُسے بتایا گیا ہے کہ یہی عین اسلام ہے، اس لئے وہ اسلام سے منحرف ہو کر، دہریت اور کمیونزم کی گود میں چلا جائیگا۔ پھر یہ حضرات خوش ہوں گے کہ خیر اگر یہاں ہمارا اقتدار باقی نہیں رہا تو اسلام بھی ختم ہو گیا ہے! جس اسلام میں ان کا اقتدار باقی نہ رہے! اس اسلام کے باقی رہنے یا نہ رہنے کی انہیں کیا خوشی ہو سکتی ہے!

۲۔ طلوعِ اسلام کے ٹائیٹل پر حدیث

طلوعِ اسلام کے قدیمی قارئین میں سے ایک صاحب لکھتے ہیں:۔
طلوعِ اسلام بابت اپریل کے ٹائیٹل پر آپ نے مولانا ابوالکلام آزاد کے حوالہ سے حسبِ ذیل حدیث درج فرمائی ہے۔

"اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ اگر تم ایسے ہو جاؤ کہ گناہ تم سے سرزد ہی نہ ہو تو خدا تمہیں زمین سے ہٹا دے اور تمہاری جگہ ایک دوسرا گروہ پیدا کر دے جس کا شیوہ یہ ہو کہ گناہوں میں مبتلا ہو اور پھر خدا سے بخشش و مغفرت کی طلبگاری کرے۔"

اس روایت کو آپ نے بلا تبصرہ شائع کیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت بھی نہ تھی۔ اس لئے کہ روایت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ نبی اکرم کی ہو نہیں سکتی لیکن آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ یہاں طلوعِ اسلام کے قارئین میں سے ایک صاحب اسے خدا کی رحمت و بخشش کے (غلط) نظریہ کی تائید میں پیش فرما رہے تھے۔ اس سے مجھے احساس ہوا کہ اس قسم کی روایات کو بلا تبصرہ نہیں شائع کرنا چاہیئے۔ اس سے سطحی بین قارئین کے دل میں غلط فہمی پیدا ہو جانیکا احتمال ہے۔

طلوعِ اسلام آپ کا شکریہ۔ یہ روایت درج کرتے وقت یہ بات ہمارے ذہن سے اتر گئی کہ

بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں، تماشائی بھی

آئندہ اس کی احتیاط برتی جائے گی۔

حقائق و عبر

۱۔ کشف و کرامات جامعہ اسلامیہ اکوڑہ خٹک کے "علمی، دینی اور اصلاحی" ماہنامہ "جامعہ اسلامیہ" کی مارچ ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں، حسبِ ذیل شذرات شائع ہوئے ہیں:۔

۱۔ مُردے نے جواب دیا فرمایا کہ ایک صاحبِ کشف حضرت حافظ محمد ضامن صاحبؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھنے لگے۔ فاتحہ کے بعد کہنے لگے۔ بھائی یہ کون بزرگ ہیں۔ بڑے دل لگی باز ہیں۔ جب میں فاتحہ پڑھنے لگا تو مجھ سے فرمانے لگے کہ جاؤ فاتحہ کسی مُردے پر پڑھو۔ یہاں زندوں پر فاتحہ پڑھنے آئے ہو۔ اُس نے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے تو لوگوں نے بتلایا کہ یہ شہید ہیں (حضرت حافظ صاحب جنگِ آزادی میں شہید ہوئے تھے)۔ (ارواحِ ثلاثہ ص۲۰۳)

۲۔ اندھے کو بینا کر دیا یہ واقعہ قاسم العلوم والخیرات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے ارشاد فرمایا ہے۔ خواجہ احمد جام مستجاب الدعوات مشہور تھے۔ ایک عورت انکی خدمت میں اپنے ایک نابینا بچہ کو لائی اور عرض کیا کہ اپنا ہاتھ اس کے مُنہ پر پھیر دیجئے اور اس کی آنکھیں اچھی کر دیجئے۔ اس وقت آپ پر شانِ عبدیت غالب تھی، اس لئے نہایت انکسار کے ساتھ فرمایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں۔ اس نے اصرار کیا، مگر آپ نے پھر وہی جواب دیا۔ غرضیکہ تین چار مرتبہ یونہی ردّ و بدل ہوئی۔ جب آپ نے دیکھا کہ وہ مانتی ہی نہیں ہے تو آپ وہاں سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے چلائے کہ یہ کام، یہ تو حضرت عیسیٰؑ کا تھا وہ اندھوں اور مریضوں کو اچھا کرتے تھے۔ میں اس قابل نہیں ہوں۔ تھوڑی دُور چلے تھے کہ الہام ہوا، تو کون اور عیسیٰؑ کون اور موسیٰؑ کون پیچھے لوٹ اور اسکے مُنہ پر ہاتھ پھیر۔ نہ تم اچھا کر سکتے ہو نہ عیسیٰؑ، مامی کنیم۔ آپ یہ سُن کر لوٹے اور "مامی کنیم، مامی کنیم" فرماتے جاتے تھے اور جا کر اس کے مُنہ پر ہاتھ پھیر دیا اور آنکھیں اچھی ہو گئیں۔ یہ قصہ بیان فرما کر مولانا نے فرمایا کہ احمق لوگ یوں سمجھ جایا کرتے ہیں کہ یہ "مامی کنیم" خود کہہ رہے ہیں۔ حالانکہ ان کا قول نہیں ہوتا، بلکہ وہ

حق تعالیٰ کا قول ہوتا ہے ۔ جب کوئی کسی گویّے سے کوئی عمدہ شعر سنتا ہے تو اس کو اپنی زبان سے بار بار دُہراتا ہے اور مزے لیتا ہے ۔ اسی طرح وہ اس الہام کی لذت سے حق تعالیٰ کا ارشاد " ما می کنیم " بار بار دہراتے تھے ۔ (ارواح ثلاثہ صفحہ ۲۰۹)

۲۔ ماں کی بددعا کا اثر

دیوبند کے ماہنامہ تذکرہ کی مارچ ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں حسبِ ذیل واقعہ شائع ہوا ہے :۔

" حدیث میں جریج کا واقعہ منقول ہے کہ وہ ایک زبردست عابد تھے ، الگ تھلگ اپنی عبادت گاہ بنا رکھی تھی ، جس میں دن رات خدا کی یاد میں مشغول رہتے تھے ۔ ایک دن ان کی ماں ایسے وقت پہنچی جب یہ بیچارے نوافل میں مشغول تھے ۔ ماں نے نام لے کر آواز دی ، یہ آواز ان کے کان سے ٹکرائی بھی اور انھوں نے جان بھی لیا کہ یہ میری محترم والدہ کی آواز ہے ، مگر عبادت کی مشغولی کی وجہ سے خاموش رہ گئے ۔ اور جی نہ چاہا کہ عبادتِ مولیٰ درمیان سے چھوڑ دی جائے ۔ ان کی ماں نے دستور کے مطابق تین مرتبہ پکارا ، جب جواب نہ ملا تو اُن کی ماں کو غصہ آ گیا اور اُن کی زبان سے یہ کلمات نکل گئے ۔ " اللّٰھم لا تمتہ حتی ینظر الی وجوہ المومسات " (اے اللہ ! جب تک یہ زناکار عورتوں کا منہ نہ دیکھ لے اسے موت نہ دے) یہ کہا اور واپس ہو گئیں ۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یہ بددعا ان پر پڑ کر رہی ۔ بنی اسرائیل میں جریج کی عبادت و ریاضت بے انتہا مشہور تھی اور یہ خود بہت مقبول ۔ آخر ہوا یہ کہ اس زمانہ کی مشہور حسینہ ان کی آزمائش کے پیچھے پڑ گئی ، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کے شر سے ہر طرح محفوظ رکھا ۔ آخر کار اس حسینہ نے ایک چرواہے سے منہ کالا کیا جو اسی گرجا کے زیرِ سایہ رہا کرتا تھا ۔ اتفاق کی بات کہ اس فتنہ پرداز حسینہ کو حمل ٹھہر گیا ۔ اور جب بچہ پیدا ہوا تو ان بے گناہ عابد درویش کے سر الزام ڈال ، لوگوں کو معلوم ہوا تو پھر کیا کہنا ۔ انھوں نے اس افواہ پر یقین کر لیا ۔ اور بغیر تحقیق سارے کے سارے اس غریب کے گرجا میں گھس آئے جنہیں قدر مار پیٹ سکتے تھے سب کیا ، اور آخر میں گرجا مسمار کر دیا ۔ اس درویش باخدا نے گھبرا کر لوگوں سے پوچھا ، آخر ماجرا کیا ہے ؟ کہ تم سب پاگل بنے ہوئے ہو ۔ ان کو بتایا گیا کہ فلاں زانیہ عورت کو بچہ پیدا ہوا ہے ، اور وہ کہتی ہے کہ تمھارا ہے ۔ انھوں نے پوچھا وہ بچہ جو پیدا ہوا کہاں ہے اُسے لے آؤ ۔ وہ لینے گئے ۔ یہ نماز کی نیت باندھ کر خدا کے آگے کھڑے ہو گئے ۔ نماز پوری کر چکے تو دیکھا کہ نوزائیدہ بچہ لایا جا چکا ہے ، جو ابھی چند دنوں کا تھا ۔ جریج درویش نے بچے کو مخاطب کر کے پوچھا ، اپنے باپ کا نام بتا دے ۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کہ اسے فوراً گویائی عطا ہوئی ۔ اور اُس نے کہا فلاں نامی چرواہا ۔ اس نوزائیدہ بچے کی یہ آواز سُن کر سارا مجمع سکتہ میں

آگیا اور جریج کی اس کرامت سے بے حد متاثر ہوا۔ سبھوں نے معافی چاہی، اپنی غلطی کا اعتراف کیا اور اجازت چاہی کہ اس گرجا کو ہم سب مل کر سونے کا بنا دیں۔ درویش نے کہا کہ نہیں، جیسا تھا ویسا ہی[1]۔

الادب المفرد میں یہ بھی ہے کہ زانیہ کا نام سن کر جریج مسکرا اُٹھے اور بعد میں لوگوں کے پوچھنے پر بتایا کہ یہ تہمت میری ماں صاحبہ کی بددعا کا نتیجہ ہے اور کچھ نہیں۔

غور کیجئے کہ غصہ کی حالت میں ماں کی زبان سے جو بات نکل گئی تھی وہ ایسے مرتاض وعبادت گذار بیٹے پر بھی پڑ کر رہی اور انھوں نے محسوس کیا کہ ماں کی بددعا نے اس انجام تک پہنچایا ہے۔

[1] - ریاض الصالحین صفحہ ۱۴۳ عن الصحیحین۔

نقد و نظر

۱۔ **الرسالۃ المستطرفہ لبیان مشہور کتب السنۃ المشرفۃ** (بزبان عربی)، مؤلفہ:- محمد بن جعفر الکتانی (متوفی ۱۳۴۵ھ)۔ مطبوعہ ٹائپ۔ صفحات ۲۱۲ شائع کردہ:- نور محمد اصح المطابع۔ کارخانہ تجارتِ کتب۔ آرام باغ۔ فریر روڈ، کراچی قیمت آٹھ روپے۔

اس کتاب میں مصنف نے اپنے احاطۂ علمی کے مطابق اپنے زمانہ تک احادیث اور اُن سے متعلقہ علوم پر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی بڑی محنت سے ایک فہرست مرتب کردی ہے۔

ابتدا میں مصنف نے بتایا ہے کہ صحابہؓ اور تابعینؒ سے سلف صالح، سوائے کتاب الصدقہ کے تمام احادیث بغیر لکھے زبانی روایت کرتے رہتے تھے۔ آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ احادیث کا نہ لکھنا اس وجہ سے تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں احادیث لکھنے سے منع فرما دیا تھا، جیسا کہ صحیح مسلم کی حدیث سے ثابت ہے، اور اس منعِ کتابتِ حدیث کی حکمت یہ تھی کہ لوگ قرآن مجید اور احادیث کو خلط ملط نہ کرسکیں۔

مختصر یہ کہ تدوین حدیث کی ابتدا پہلی صدی کے آخر میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے عہد میں اُس وقت ہوئی جب صحابہؓ و تابعینؒ میں سے وہ بزرگ ہستیاں اُٹھ چکی تھیں جو اس بارے میں سند کی حیثیت رکھتی تھیں۔

بہرحال یہ کتاب علم حدیث سے دلچسپی رکھنے والوں کو خاصی مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔

۲- **PRAYERS OF MOHAMMAD**

مرتّبہ:- عبدالحمید فریدی - ایڈووکیٹ - مقدمہ:- ریورینڈ (پادری) ڈبلیو - کیو - لیش - بشپ آف بمبئی - زبان:- انگریزی - ناشر:- کارخانہ تجارتِ کتب - آرام باغ - کراچی - ضخامت:- ۲۰۰ صفحات - قیمت سولہ روپے -

اس کتاب کے پہلے حصہ میں حضرات انبیائے کرام اور دیگر صالحین کی ان دعاؤں کو جمع کیا گیا ہے جو قرآن کریم میں مذکور ہیں - دوسرے حصہ کے شروع میں سیرتِ نبی اکرمؐ کا مختصر سا بیان ہے، جسے مارماڈیوک پکتھال کے ترجمۂ قرآن سے نقل کیا گیا ہے - اس کے بعد اُن دعاؤں کو درج کیا گیا ہے جنہیں ابو سعید محمد انصاری مرحوم نے اپنی کتاب حزب المقبول میں کتبِ احادیث کے حوالے سے جمع کیا تھا - عربی متن کے سامنے انگریزی ترجمہ بھی ہے جس میں کوئی خصوصیت نہیں - ہمارا تاثر یہ ہے کہ مؤلف نے یہ ساری محنت نہایت نیک نیتی سے بغرضِ حصولِ ثواب کی ہے - اس سے زیادہ ہمیں اس کی افادی حیثیت معلوم نہیں ہو سکی -

۳- **البرامکہ**

مرتّبہ:- مولانا عبدالرزاق کانپوری (مرحوم) شائع کردہ:- نفیس اکیڈیمی - بلاسس سٹریٹ - کراچی

قیمت:- بارہ روپے -

برمکی خاندان کے عروج و زوال کی داستان ہماری تاریخ کی ایک عبرتناک داستان ہے - عبّاسی سلطنت کے آغاز سے ہارون الرشید کے عہد تک اس خاندان نے نسلاً بعد نسلٍ عظمت و شہرت کے جو شہرۂ آفاق معرکے سر کئے، اور حکومت عباسیہ کے نظام و سیاست پر اپنے جاہ و جلال کا سکہ جما کر انھوں نے جس دریا دلی سے علم و ادب، فلسفہ و حکمت، نغمہ و شعر اور تہذیب و تمدّن کے مختلف شعبوں میں اربابِ فن کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی، تاریخ کے اوراق اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز ہیں -

مولانا عبدالرزاق مرحوم کی "البرامکہ" اسی شہرۂ آفاق خاندان کے تاریخی پس منظر اور عروج و زوال کے مختلف ادوار کی محققانہ تفصیل ہے - مولانائے مرحوم کو اپنی تحقیقی صلاحیتوں اور کاوشِ فکر کے اعتبار سے جو درجہ حاصل ہے "البرامکہ" بجا طور پر اس کا شاہکار قرار پا سکتی ہے - برمکی زعماء کے حالات و کوائف اور تاریخی کارناموں کے ساتھ ساتھ اس کتاب کے اوراق میں عہدِ قدیم کے ایران اور دورِ عباسیہ کی تاریخ کے بہت سے دوسرے گوشے بھی نمایاں ہو کر سامنے آ گئے ہیں - ۱۸۹۶ء میں پہلی بار یہ کتاب شائع ہوئی - اس کے بعد دس بارہ سال کی مدت میں یکے بعد دیگرے اس کے چار ایڈیشن شائع ہوئے - اور پھر کم و بیش گذشتہ نصف صدی سے یہ نایاب چلی آ رہی تھی - پچاس برس کے بعد نفیس اکیڈیمی کی طرف سے ازسرِ نو اس کی طباعت و اشاعت کا اہتمام اردو لٹریچر کے سرمائے میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے - اس سے پہلے، اس اکیڈیمی کی طرف سے مولانائے مرحوم کی ایک اور کتاب "نظام الملک طوسی" بھی شائع ہو چکی ہے - جس پر طلوعِ اسلام کے اوراق پر تبصرہ ہو چکا ہے - "البرامکہ" کو اس تاریخی سلسلہ کی دوسری کڑی سمجھئے -

---

"میثاق" کی اشاعت میں التواء

پریس کی تبدیلی کے سلسلہ میں ماہنامہ "میثاق" کی اشاعت میں التواء ناگزیر ہے -

(مینیجر ماہنامہ میثاق لاہور)

دھتکارے ہوئے انسان

(محترم عنایت اللہ صاحب)

[اکتوبر ۷۵ء کے طلوعِ اسلام میں محترم عنایت اللہ صاحب کا ایک مضمون "آخری سہارے" قارئین کی نظروں سے گزر چکا ہے۔ وہ مضمون اس قدر پسند کیا گیا کہ قارئین کی طرف سے مسلسل تقاضے آتے رہے کہ اس سلسلہ کی مزید کڑیاں بھی طلوعِ اسلام میں شائع ہونی چاہئیں۔ عنایت صاحب نے طلوعِ اسلام کنونشن میں ۱۸ر اپریل کی شب اپنی آپ بیتی کے کچھ "طیورِ آوارہ" سامعین کے سامنے پیش کئے جنہیں بڑی دلچسپی سے سُنا گیا۔ ان کی یہ تحریر قارئین کے پیشِ خدمت ہے۔ عنایت صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس سلسلہ کو جاری رکھیں گے۔ اس کے لئے ہم اُن کے شکر گزار ہیں..... طلوعِ اسلام]

ہمارے معاشرہ کا تقریباً ہر گوشہ ہمارے سامنے اس طرح بے نقاب رہتا ہے کہ ہم اس کی تمام خرابیاں اور قباحتیں آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کا علاج کرتے ہیں یا نہیں۔ لیکن ایک گوشہ ایسا ہے جو ہمارے سامنے ہوتے ہوئے بھی ہم سے مستور رہتا ہے۔ اس گوشہ کو عرفِ عام میں جیل خانہ کہا جاتا ہے۔ ان اونچی اونچی دیواروں میں ایک آہنی دروازہ ہے جو ہر صبح اور شام کھلتا ہے۔ اور ہر صبح اور ہر شام بیسیوں انسانوں کو نگل اور اُگل دیتا ہے۔ انسانوں کا ایک نہ تھمنے والا دریا ان دیواروں کے اندر بہا چلا جا رہا ہے، اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر۔

جیل کے مکینوں کا ہاتھ قلم پر نہیں ہوتا، نہ پاؤں زندگی کی عام راہوں پر۔ وہ کرتے ہیں اور بھرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کھتے ہیں اور بھرتے ہیں۔ اور بعض ایسے بھی ہوتے ہیں کہ کرتے نہیں لیکن بھرتے ہیں۔ لیکن یہ سب سہتے ہیں کہتے نہیں۔ اس طرح دو دنیائیں وجود میں آتی ہیں۔ ایک دنیا جو جیل کی چار دیواری میں قید ہے اور دوسری دنیا جو جیل کے مکینوں کے سینوں میں قید ہے۔ یہ دونوں دنیائیں جہنم ہیں اور دونوں ہماری نظروں سے اوجھل رہتی ہیں۔ ہمیں اسی قدر نظر آتا ہے کہ جیل میں چور ہیں، اُچکے ہیں، اُٹھائی گیرے اور گرہ کٹ بند ہیں۔ قفل شکن اور ڈاکو ہیں اور وہاں قاتل اور عصمتوں کے لٹیرے قید ہیں۔ چنانچہ ہم یک زبان فیصلہ دے دیتے ہیں کہ جیل کے مکین سب سے بڑے سوشل EVIL ہیں، انہیں قید میں ہی پڑا رہنے دو، اور

سخت ترین سزائیں دو۔

ذاتی مشاہدات

میرا اپنا نظریہ کچھ اسی قسم کا تھا۔ میں نے جیل کے متعلق چند ایک رپورتاژ پڑھے تھے۔ اس سے میں نے سمجھا تھا کہ جیل کے اندر کے حالات کے متعلق میں سب کچھ جاننے لگ گیا ہوں۔ مگر جب مجھے خود قیدی کی حیثیت سے وہاں جانا پڑا تو میں نے دیکھا کہ میں جیل کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ اور جنھوں نے رپورتاژ لکھے تھے وہ محض آپ بیتیاں تھیں یا قیدیوں کے متعلق ہلکی سی چند ایک جھلکیاں۔ وہاں جا کے مجھے محسوس ہوا کہ معاشرہ نے یہ اہم ترین گوشہ کس بیدردی سے اوجھل کر رکھا ہے۔

جسے ہم نے سوشل EVIL کا نام دے رکھا ہے وہ نہ جانے کتنے ہی سوشل EVILS کا مرکب ہے۔ ان قباحتوں کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے محض مبصّر کی حیثیت سے جیل جانا بیکار ہے۔ انہیں سمجھنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ یہ کہ وہاں قیدی کی حیثیت سے سال چھ ماہ گزارے جائیں۔ ہم میں سے شاید ہی کبھی کسی نے سوچا یا دیکھا ہو کہ یہ جو دو دو چار چار آدمی، پولیس کے نرغے میں عام راہ سے ہٹ کر ذرا اُدھر کو ہو جاتے ہیں اور اونچی دیواروں میں گم کر دیئے جاتے ہیں، اُن کے ساتھ ہوتا کیا ہے؟ اور تو اور، جن کو یہ دیواریں اُگل کر باہر پھینک دیتی ہیں وہ بھی زبان پر کم ہی لاتے ہیں کہ اُن پر کیا بیتی، اور یہ اتنا عرصہ اُن کی ذہنی حالت کیا رہی۔ ہمارے جیل قبر سے کم نہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ قبر سے آدمی لوٹتا نہیں اور قبر ایک بھید بن جاتی ہے لیکن جیل سے لوگ لوٹ آتے ہیں پھر بھی وہاں کے حالات بھید ہی رہتے ہیں، اس لئے کہ وہاں سے آنے والا یا تو گونگے کا گڑ کھا لیتا ہے، اور یا جو کچھ وہ کہتا ہے لوگ اُسے دیوانے کا خواب سمجھ کر جھٹک دیتے ہیں۔

ہم اپنے محقق قرآن جناب پرویز صاحب کو تو جیل بھیجنے سے رہے کہ جائیے صاحب! سال چھ ماہ وہاں بھی گزار آئیے اور واپس آ کر معاشرہ کے اس گوشہ پر بھی کچھ لکھیے۔

محض اتفاقی حادثہ تھا یا قانونِ فطرت کے پروگرام کی کوئی ناقابلِ فہم کڑی، کہ ایک فرزندِ قرآن کو وہاں دو برس گزارنے پڑے۔ اب یہ فرزندِ قرآن آپ کو آپ بیتی سنا رہا ہے، جو بظاہر آپ بیتی ہے، لیکن ہے جگ بیتی۔ سوچتا ہوں کہ اس ذرا سے وقفہ میں ساری بات کیسے کہہ سکوں گا۔ بمشکل ایک جھلک دکھا سکوں گا۔

مجھے یاد ہے۔ میرے سکول کے راستہ میں تھانہ پڑتا تھا۔ میں تھانے اور تھانیداروں سے اس قدر ڈرا کرتا تھا کہ دُور کا چکر کاٹ کر سکول جایا کرتا تھا۔ سپاہی کو دیکھ کر مجھ پر خوف طاری ہو جایا کرتا تھا۔

گرفتاری اور اس کا نفسیاتی رد عمل

۱۹۵۶ء کی وہ شام میری زندگی کی تاریک ترین شام تھی جب ایک سپاہی ہتھکڑی اُٹھائے میری طرف بڑھا۔ میں بچّے

کی طرح سہم گیا۔ میرا جسم تھر تھر کانپنے لگ گیا۔ اور جب سپاہی نے مجھے ہتھکڑی پہنا کر چابی جیب میں ڈال لی تو میرا لرزہ تھم گیا وہ خوف جو میں بچپن سے اعصاب پر اٹھائے اٹھائے پھر رہا تھا ہتھکڑی کی جھنکار میں غائب ہو گیا۔ میں دل ہی دل میں ہنس دیا۔ دوسرا مرحلہ زیادہ رُوح کُش تھا .... حوالات .... مجھے جب حوالات کے دروازے کے سامنے کھڑا کیا گیا تو سنتری نے تالا کھولا۔ میری داخلی دنیا میں مہیب دھماکہ ہوا۔ خوف اور دہشت نے میری رُوح کی بنیادوں تک کو ہلا دیا۔ میں نے اپنے آپ کو ایسی کھائی کے منہ پر کھڑے پایا جس کی تہ نہ جانے کتنی دُور تھی۔ اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ پھر مجھے جیسے دھکا دیدیا گیا۔ میں تیزی سے نیچے گرنے لگا، گرتا گیا اور نیچے گرتا ہی چلا گیا۔ تاریکی تاریک تر ہو گئی۔ اس قدر بلندی سے گر کر میرا انگ انگ کراہ رہا تھا، رُوح سے خون ٹپک رہا تھا، ضمیر چیخ رہا تھا، انانیت پر شدید چوٹیں آئی تھیں اور اعصاب چکنا چور ہو گئے تھے۔ اور گرد و بُو بہت تیز تھی۔

حوالات کی دُنیا

میں نے آنکھ کھولی تو حوالات کا دروازہ بند ہو چکا تھا، اور میں تنگ سے ایک کمرے میں سات ننگ دھڑنگ جرائم پیشہ ملزموں کے نرغے میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ ساتوں ملزم دھوتی یا پاجامہ پہنے ہوئے تھے، نہ قمیص نہ بنیان۔ مہینہ مئی کا تھا۔ گرمی جھلسا رہی تھی۔ اُن کے غلیظ جسموں سے پسینہ بہہ بہہ کر اُن کی دھوتیوں اور پاجاموں میں جذب ہو رہا تھا۔ بدبو اور تعفن کا یہ عالم کہ مجھے متلی آنے لگی۔ کمرے کے فرش پر جگہ جگہ تھوکا ہوا تھا، ایک دروازہ بیت الخلا میں کھلتا تھا (جو صرف کھاتا تھا) کمرے کے ایک کونے میں انتہائی غلیظ اور بوسیدہ کمبلوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ اس ڈھیر سے چھوٹے چھوٹے کیڑے نکل نکل کر فرش پر رینگ رہے تھے اور دیواروں کے ساتھ کھٹملوں کے قافلے آ جا رہے تھے۔ منہ ہاتھ دھونے کا کوئی انتظام نہیں تھا، پسینہ سے ہی چہرے دُھل رہے تھے۔

یہ سات ملزم جرائم پیشہ تھے اور دو دو تین تین بار کے سزا یافتہ۔ وہ خوش گپیوں میں مصروف تھے اور اس طرح ہنس کھیل رہے تھے جیسے گاؤں میں بڑ کے سائے تلے بے فکر بیٹھے ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی چُپ ہو گئے، اور میرے قریب سرک آئے۔ جب وہ قریب آئے تو اُن کے جسم جلتے ہوئے محسوس ہوئے اور گوشت کی سڑاند میرے دماغ کو چھلنی کر گئی۔ وہ ساتوں حوالات اور بیت الخلا کی غلاظت کا اہم ترین حصّہ معلوم ہوتے تھے۔

"لاؤ بے! بابو کے لیے دو تین اچھے اچھے کمبل لا" ایک نے کہا، اور ایک نوعمر ملزم اُچک کر کمبلوں کے ڈھیر پر جا پڑا اُس نے تین "اچھے اچھے" کمبل نکالے، اُنھیں تہ کر کے گدیلا بنا کر مجھے اُس پر بٹھا دیا۔ ایک اور ملزم نے دھوتی کے پلّو سے ایک بیڑی نکالی اور بیت الخلا میں چلا گیا۔ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں جلتی ہوئی بیڑی تھی جو اُس نے چھپائے ہوئے میری طرف بڑھائی اور بولا۔ "ایک طرف ہو کر کش لگا لو۔ سنتری پرے گیا ہوا ہے۔ یہاں بیڑی سگریٹ کی سخت ممانعت ہے۔"

بیڑی پیش کرنے اور پلانے کا طریقہ مجرمانہ ہی سہی لیکن انداز کے پیچھے پن اور خلوص کو میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ بخدا اپنی سوسائٹی میں مجھے اتنے پیار سے کبھی سگریٹ پیش نہیں کیا گیا۔ اُس روز تو میں مسلسل پانچ چھ گھنٹوں سے سگریٹ کے ایک کش کو ترس رہا تھا، سپاہی مجھے پولیس ہیڈکوارٹرز میں لیے بیٹھے رہے تھے۔ میں نے انھیں بار بار کہا تھا کہ ایک سگریٹ پی لوں تو انھوں نے ہر بار "اوں ہوں" کہہ کر منع کر دیا تھا۔ میرے پاس ڈیڑھ روپیہ تھا۔ میں نے ایک سپاہی کو چونّی دی کہ دو تین سگریٹ لا دو۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ سپاہی نے "اوں ہوں" نہ کہی اور چونّی لیکر بولا۔ "ابھی لائے دیتا ہوں"۔ یہ چونّی دیئے آج چار سال اور گیارہ مہینے ہو گئے ہیں، میں جیل سے بھی لوٹ آیا ہوں، لیکن میری چونّی کے سگریٹ ابھی تک نہیں آئے۔

میں ایک کش کو ترس رہا تھا، مُلزم نے مجھے چوری چھپے بیڑی دی تو میں نے پرے ہو کر کش لگا لیا۔ اس طویل کش کا دھواں جب میرے پھیپھڑوں میں داخل ہوا تو میں اپنے اندر ایک تبدیلی محسوس کرنے لگا جو نہایت سُرعت سے رُونما ہو رہی تھی۔ اس تبدیلی کا محرک بیڑی کا دھواں نہیں تھا بلکہ وہ خلوص تھا جس سے یہ بیڑی پیش کی گئی۔ یوں لگا، جیسے ان ملزموں کے جسموں کی بدبُو کم ہونے لگی ہے۔

ایک مُلزم نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس کیس میں گرفتار ہوا ہوں، تو میں نے اُنھیں مختصراً اپنا کیس سُنا دیا۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک دو سنجیدہ ہو گئے اور باقی مسکرا دیئے۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں بابو!" ایک نے ہمدردی سے بھرپُور لہجے میں کہا۔

"حوالات میں بہت تکلیف ہوتی ہے بابو!" ایک اور بولا۔ "لیکن ہم تمھیں کوئی تکلیف نہیں ہونے دیں گے"۔

"یہ ہماری دنیا ہے بیٹا"، ایک معمّر قفل شکن نے الفاظ میں پیار کا نکھرا ہوا رنگ پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "تم قسمت کے مارے اِدھر آ نکلے ہو۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ تم نے جُرم کیا یا نہیں، تمھاری خدمت داری ہمارا فرض ہے۔ ہم تو چور، اُچکے، اُٹھائی گیرے ہیں، کل یہاں سے نکلیں گے پرسوں پھر آ جائیں گے"۔

"گھبرانا نہیں بابو!" نوعمر گرہ کٹ نے کہا "تم مرد ہو، ڈرنا نہیں، پولیس اور ہتھکڑی کا خوف دُور دُور سے ہی ہوتا ہے" اور میں نے عیاں طور پر محسوس کیا کہ میں ڈر نہیں رہا، نہ گھبرا رہا ہوں۔ یہی تھی وہ تبدیلی جو مجھ میں سُرعت سے رُونما ہو رہی تھی۔

"میں حیران ہوں ......" ایک اَدھیڑ عمر جیب تراش بولا۔ "کہ پولیس پڑھے لکھے آدمیوں کو ہم میں کیوں لا بند کرتی ہے؟ اچھے لوگوں کے لئے تو صاف سُتھرا کمرہ ہونا چاہیئے"۔

اُس نے میری طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا، لیکن میں خود سراپا سوال بنا بیٹھا تھا۔ میں بھی یہی پوچھنا چاہتا تھا کہ ابھی قانون نے یہ فیصلہ نہیں دیا کہ جسے گرفتار کیا گیا ہے وہ مجرم ہے یا نہیں۔ پھر اُسے کس جُرم میں اس بیت الخلا میں لا کر بند کیا جاتا ہے؟ اُسے کسی صاف سُتھرے کمرے میں بھی زیرِ حراست رکھا جا سکتا ہے۔ کسی کی گرفتاری پر تو اعتراض نہیں، لیکن یہ

گرفتاری ایک مفروضہ کی بنا پر عمل میں آتی ہے۔ پھر یہ ثابت کرنے کے لئے کہ یہ مفروضہ صحیح تھا یا غلط، ملزم کے خلاف مقدمہ چلتا ہے، اور آخر الامر قانون فیصلہ دیتا ہے کہ یہ مجرم ہے یا نہیں۔ اگر مجرم ہے تو سزا کا مستحق ہے۔ گویا سزا کا دور بہت عرصہ بعد شروع ہوتا ہے۔ لیکن موجودہ طریقِ کار میں تو گرفتاری کے فوراً بعد ملزم کو مجرم سمجھ کر اُسے وہ سزا دیجاتی ہے جو اکثر اوقات اس کی اصل سزا سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ اس کے دل میں خود اس نظامِ عدل کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات اُبھرنے شروع ہو جاتے ہیں، اور دوسرا نتیجہ یہ کہ اچھا بھلا انسان جرائم پیشہ لوگوں میں مل بیٹھ کر اُنھیں کے اثرات قبول کر لیتا ہے۔ پولیس نے حال ہی میں پہلا قدم تو اُٹھایا ہے۔ حکم نامہ جاری کیا گیا ہے کہ آئندہ کسی ملزم کو ہتھکڑی نہ لگائی جائے، لیکن حوالات کی اصلاح کے متعلق ابھی کچھ سُننے میں نہیں آیا۔

مجرموں کی داستانیں

شام تک میں نے تمام خوف اور خدشے جھٹک ڈالے اور میں حوالات کی غلاظت کا حصہ بن گیا۔ شام کے بعد داستان گوئی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُن ساتوں نے مجھے باری باری کہانیاں سُنائیں ـــــ عشق و محبت کی کہانیاں، جرم و گناہ کے قصّے، عُریاں اور فحش داستانیں، جیب تراشی اور نقب زنی کی وارداتیں، تالے توڑنے کے کامیاب طریقے، جیب کاٹنے کے دلچسپ حربے، پولیس سے بچنے کے پُرمغز ہتھکنڈے، گرفتاری کے بعد قانون کی آنکھوں میں دُھول جھونکنے کے کارگر نسخے، لُوٹی ہوئی نقدی سے عیاشیوں کی تفصیلات، مختلف طوائفوں کی سوانح حیات، جُرم کی "برکتیں" اور قانون کی "بے بسی" ـــــ اور میں ان ایک ہزار ایک داستانوں میں اس قدر کھو گیا کہ ان جرائم پیشہ لوگوں کی زمین دوز دنیا مجھے پریوں اور شہزادوں کے دیس کی طرح نظر آنے لگی۔ ان کہانیوں میں لذتیت غالب تھی اور قانون اور جیل کا خوف ناپید۔ سوچئے کہ کتنے معصوم اور شریف قلوب ہوں گے جو جرائم کے احساس سے لرزاں و ترساں حوالات میں جاتے ہوں گے، اور ان جرائم پیشہ ہم نشینوں کی ان باتوں کے اثرات سے، جُرم کی لذتوں کا شوق لئے باہر آتے ہوں گے۔

میں نے سوچا تھا کہ اس بھیانک غار میں مجھے نیند نہیں آسکے گی، لیکن غار کے مکینوں نے میرے اعصاب کو ایسے پیارے انداز سے سہلایا کہ میں لیٹا اور سو گیا۔

پَو پھٹ رہی تھی کہ میری آنکھ کھُلی۔ میں نے یوں کروٹ بدلی جیسے اپنے گھر لیٹا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے دل جیسے کئی دھڑکنیں خاموش رہ کر بہت تیزی اور بے قاعدگی سے دھڑکنے لگا۔ اس احساس نے کہ میں قید ہوں، اور یہ زنداں کی پہلی سحر ہے میری گردن دبوچ لی اور دم گھٹنے لگا۔ میں اُٹھ بیٹھا، سلاخوں سے جھانک کر دیکھا، سحر طلوع ہو رہی تھی ـــــ اُداس اُداس سی سحر، دُکھیاری سی ـــــ اس کے اُجالے کو جیسے شب کی تیرگی نے ڈس لیا ہو۔ دل اُچھل کر حلق میں

آ اٹکا۔ اور میں آنسوؤں کو آنکھ کے کٹوروں میں چھلکنے والے آنسوؤں کو دل کے آبگینے کی طرف لوٹا دینے کی ناکام کوشش میں مصروف ہوگیا۔

میں نے کندھوں پر ہلکے ہلکے دو ہاتھ محسوس کئے۔ گھوم کر دیکھا۔ ایک جرائم پیشہ مُلزم میری پیٹھ دبانے کو کھڑا تھا۔ بولا۔

"فرش پر لیٹ کر پیٹھ اکڑ جاتی ہے، آپ دو چار روز میں عادی ہو جائیں گے۔ لایئے ذرا دبا دوں۔"

میرا دل جو اُچھل کر حلق میں آ اٹکا تھا، لوٹ کر اپنی جگہ چلا گیا، اور بڑے مزے سے دھڑکنے لگا۔ یہ مُلزم وہ انسان تھا جو اب چوتھی بار جیل جا رہا تھا۔ بیسیوں گھروں کے تالے توڑ چکا تھا، ڈیڑھ دو سو جیبیں کاٹ چکا تھا، گرفتار صرف تین بار ہوا تھا، اور اب چوتھی گرفتاری پر دو سال قید کی توقع لئے ہوئے تھا۔

میری زندگی کی یہ پہلی صبح تھی جو شیو، غسل اور ناشتہ جیسی پابندیوں سے آزاد تھی۔ حوالات میں یہ "عیاشیاں" ممنوع ہوتی ہیں۔ گپ بازی کے سوا کوئی شغل نہ تھا۔ ساتوں ملزم میرے ارد گرد جمع ہوگئے۔ انھوں نے مجھے چوری چھپے بیڑیاں پلائیں، اور اپنی دلچسپ باتوں اور ہمدردانہ لب و لہجے سے میرا دل بہلایا۔ (یہ "دلچسپ" باتیں بہت طویل ہیں اور بہت اہم، میں انہیں کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں)۔

جرائم کا پس منظر

یہ ہیں وہ لوگ جنھیں ہم نے معاشرہ کے خطرناک عناصر کا نام دیکر دھتکار دیا ہے، اور وہ جدھر جاتے ہیں "چور، اُچکے، گرہ کٹ" کی آوازیں اُن کے گرد منڈلاتی رہتی ہیں۔ لیکن میں نے اِن میں سے اکثر کے رُوپ میں ڈھکی چھپی انسانیت دیکھی ہے۔ بخدا وہ اچھے بھلے انسان ہیں، اور محض لغزشِ پا کے مجرم۔ ان کی فطرت مجرم نہیں ہوتی۔ یہاں میں صرف دو مثالیں مختصراً پیش کرتا ہوں:-

بھنگی ذات کا ایک جوان سال آدمی چرس کی ناجائز فروخت کے الزام میں قید تھا۔ بچپن سے اُسے پڑھنے کا بے حد شوق تھا، اور بھنگیوں کے کام سے نفرت۔ وہ لوگوں کی غلاظت اُٹھانے کی بجائے سکول کی طرف چل پڑا۔ سکول والوں کو معلوم ہوا کہ وہ بھنگی ہے تو اُسے داخلہ نہ ملا۔ تین سکولوں سے دھتکارے ہوئے بچے نے ایک گھر میں ملازمت کر لی۔ اُس وقت اُس کی عمر دس گیارہ برس ہو چکی تھی۔ اُس نے گھر کی بیگم کو بتایا کہ اُسے پڑھنے کا شوق ہے۔ اور یہ نہ بتایا کہ وہ بھنگی ہے۔ مگر چند ہی روز بعد گھر کے بھنگی نے انھیں بتا دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکے کو بیگم نے گھر سے نکل جانے کو کہا۔ لڑکے نے قسمیں کھائیں، رویا چیخا کہ اُس نے یہ غلیظ کام کبھی نہیں کیا، اور وہ ہمیشہ صاف ستھرا رہا ہے۔ لیکن بیگم نے اُسے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا۔

لڑکے نے اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اُس کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہاں سے نکلتے نکلتے

نظر بچا کر بیگم کا ایک فراک اٹھا لایا۔ سوچا، مجھے نوکری نہیں ملتی اسے فراک نہیں ملے گا۔۔۔۔۔۔ یہ تھا دھتکارے ہوئے لڑکے کا انتقام۔

اُس نے انتقاماً چرایا ہوا فراک کباڑی کے ہاتھ پانچ روپے پر بیچ دیا اور پیسے باپ کو جا دیئے۔ غریب باپ نے یہ بھی نہ پوچھا کہ اتنے روپے لایا کہاں سے ہے۔ اُس نے اُسے شاباش دی۔ نتیجۃً اُٹھائی گیری کا یہ سلسلہ چل نکلا۔ لڑکے کو ہر گھر سے "بھنگی بھنگی" کی طنز آلود آوازیں سُنائی دیتی تھیں، اور وہ جہاں داؤں لگتا ایک آدھ چھوٹی موٹی چیز، یا رسیوں پر ٹنگے ہوئے کپڑے، یا کوئی برتن اُٹھا لاتا اور کباڑی کے ہاں بیچ دیتا۔ پہلی بار پکڑا گیا تو اُسے تین ماہ کی سزائے قید ہوئی۔ جیل میں پُرانے استاد بھی مل گئے، اور جیل کا خوف بھی دُور ہو گیا۔ چنانچہ وہ لڑکا جوانی کے آغاز تک دوبارہ سزا کاٹ کر پختہ کار جرائم پیشہ بن چکا تھا۔ اِس حُزنیہ کا دردناک ترین پہلو یہ ہے کہ اب وہ اپنے چھوٹے بھائی کو (جس کی عمر بمشکل دس برس تھی) اسی پیشہ کے لئے تیار کر رہا تھا۔

یہ لڑکا کل مجھے باتیں سُنا رہا تھا کہ مجھے پیاس محسوس ہوئی۔ پاس ہی ایلومونیم کا ایک گلاس اور جگ رکھا تھا۔ میں گلاس میں پانی اُنڈیل کر پینے لگا تو یہ "بھنگی" مجھ پر ٹوٹ پڑا۔۔۔۔۔۔ "نہ نہ نہ! یہ میرا گلاس ہے۔ اس میں نہ پینا"۔۔۔۔۔۔ لیکن میں نے اُسی گلاس میں پانی پی لیا۔ اور وہ مجھے یوں پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے میں نے مسمریزم کا کرتب کر دکھایا ہو۔ آہستہ سے بولا "بابو! تو نے میرا جھوٹا پانی پیا ہے؟"۔۔۔۔۔ میں نے کہا کہ میں مسلمان ہوں، اور مسلمان انسان اور انسان میں فرق نہیں کیا کرتا۔ اُس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی۔ اس لئے کہ وہ مسلمانوں کے گھروں کا دھتکارا ہوا تو وہاں پہنچا تھا۔

رات بھر وہ لڑکا میرا سَر دباتا رہا اور میرے کمبل سے کھٹمل مارتا رہا۔ صبح چار بجے میری آنکھ کھُلی تو میں نے اُس سے کہا۔۔۔۔۔ "خدارا مجھے یوں شرمندہ نہ کرو"۔۔۔۔۔۔ لیکن وہ میری پیشانی سہلاتا ہی رہا۔ آخر میں نے اس کا ہاتھ پرے کر کے کہا۔ "میں کوئی پیر پیغمبر تو نہیں ہوں کہ تم رات بھر میری مُٹھی چاپی کرتے رہے ہو"۔ وہ "بھنگی" عجیب وغریب لہجے میں بولا۔ "بابو! تو نے میرا جھوٹا پانی پیا ہے، میں تیرے پاؤں دھو کر پیئوں گا"۔

سوال پیدا ہونا لازمی ہے کہ سوشل EVIL یہ بھنگی ہے یا وہ کول، جس نے اس پر تعلیم کے دروازے بند کئے۔ یا وہ گھر جہاں سے اُسے دھتکارا گیا۔ یا وہ جیل، جس نے اُسے منجھے ہوئے غنڈوں میں پھینک دیا؟

وہیں حوالات میں ایک ماسٹر جیب کترا ملا جس نے بارہ برس کی عمر میں پہلی جیب کاٹی تھی اور پچیس برس سے جیبیں ہی کاٹ رہا تھا۔ وہ تقریباً ہر جرم میں ماہر تھا لیکن جیب تراشی میں وہ یکتا تھا۔ اُس کی کہانی بہت طویل ہے، جسے میں ایک دن "ایک شہر ہزار داستان" میں پیش کر رہا ہوں۔

اس کے ذمہ دار کون ہیں؟

اس شخص کو جرائم پیشہ بنانے کے ذمہ دار چار عناصر ہیں، جن میں ایک مسجد کے پیش امام صاحب بھی ہیں۔ یہ جیب کترا

اپنا نفسیاتی تجزیہ بھی کر سکتا تھا، اور اُس وقت انگریزی میں اپنی ڈائری بھی لکھ رہا تھا۔

مذہب کے خود ساختہ خداؤں سے بغاوت

مولوی کے کردار کا اُس پر یہ اثر تھا کہ وہ مولوی تو مولوی، خدا کی ذات کا بھی مُنکر تھا۔ اُس نے میرے ساتھ بات شروع ہی اس فقرے سے کی تھی کہ میں خدا کو نہیں مانتا۔ اُس شخص کی رگ رگ، ریشے ریشے اور بال بال میں جُرم سمویا پڑا تھا۔ اُس کا نام شیدا تھا۔

ایک روز مجھے کہنے لگا۔ "عنایت! تم علی الصبح سورۂ مزمّل پڑھا کرو۔ خدا تمھیں نجات بخشے گا۔"

میں نے ہنس کر کہا۔ "شیدا بھائی! تم تو خدا کو مانتے ہی نہیں"۔۔۔۔ تو وہ عجیب سنجیدگی سے بولا۔ "ارے نہیں بھائی! وہ دوسرا شیدا ہے، گرہ کٹ شیدا۔ وہ خدا کو نہیں مانتا۔ میں تو مانتا ہوں۔"

یعنی وہ شخص اپنی DUAL شخصیت بے نقاب کر رہا تھا۔ ذرا غور فرمائیے کہ ان دونوں عادی مجرموں میں انسان زندہ تھا، لیکن معاشرتی عناصر نے اس انسان کا چہرہ مسخ کر رکھا تھا۔

عدالت میں پہلی حاضری

ہاں! تو میں حوالات کی پہلی صبح کا ذکر کر رہا تھا۔ دس بج رہے تھے کہ سلاخوں میں سے ایک سپاہی نے جھانک کر پوچھا۔ "عنایت کون ہے؟"

میں اٹھا تو دروازہ کھلا اور مجھے باہر نکال لیا گیا۔ سپاہی نے ہتھکڑی آگے کی اور کہا۔ "عدالت سے تمھارا ریمانڈ لینا ہے۔"

ایک روز پہلے جس ہتھکڑی کو دیکھ کر میں لرز اُٹھا تھا، اُسے دوسری بار پہنتے ہوئے مجھے ذرہ بھر خوف یا شرمندگی محسوس نہ ہوئی۔ میں نے اپنے ہاتھ یوں آگے کر دیئے، جیسے عورت بڑے شوق سے چوڑیاں چڑھوانے لگتی ہے۔ لیکن اس کے بعد کا مرحلہ کٹھن ترین تھا۔ مجھے ہتھکڑیاں پہنا کر سرِعام لیجایا جا رہا تھا، اور ایک ہجوم مجھے گھور رہا تھا۔ میں زمین میں گڑا جانے لگا۔ پاس سے گزرتے ہوئے لوگ مجھے رُک رُک کر دیکھتے تھے، اور میں سر جھکائے یوں چلا جا رہا تھا، جیسے مجھے کھسیٹا جا رہا ہو۔ ایک ہی راہِ فرار تھی کہ میں آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو فریب دے لیتا کہ مجھے کوئی بھی نہیں دیکھ رہا۔ عدالت کے احاطہ میں ہجوم اور زیادہ تھا۔ ہر کوئی مجھے گھور رہا تھا۔ یوں ہتھکڑیوں میں جکڑے ہوئے ہجوم میں کھڑا کیے جانا، ایسا حادثہ تھا، جس کے مقابلہ میں موت معمولی سا حادثہ نظر آتی ہے۔

مجھے مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا، اور بارہ روز کا ریمانڈ لے لیا گیا۔ گویا مجھے مزید بارہ روز حوالات میں ہی رہنا تھا

دو گھنٹے بعد مجھے واپس لاکر حوالات میں بند کیا گیا تو وہی غلیظ کمرہ مجھے پُرسکون پناہ گاہ کی طرح نظر آیا۔ میں اُن سات ملزموں میں یوں جا گیا جیسے دن بھر کا بھولا بھٹکا، ڈرا سہما ہوا بچہ، اپنے گھر پہنچ جاتا ہے۔

بارھویں روز مجھے پھر ہتھکڑی لگا کر مجسٹریٹ کے سامنے لے جایا گیا۔ اب پھر ہجوم مجھے گھُور رہا تھا لیکن میری حالت پہلے سے بہتر تھی، کیونکہ میں پہچانا نہ جا سکتا تھا۔ بارہ روز شیو نہیں کیا تھا، منہ نہ دھلا، بال پسینے سے جڑے ہوئے اور گرد آلود تھے، اور سب سے بڑی بات یہ کہ میں اب اس ذلّت و رسوائی کا عادی ہو چکا تھا۔ شرم و ندامت مجھ سے متنفر ہو کر الگ ہو گئی تھی۔ (یا یوں سمجھئے کہ شرم و ندامت مجھ سے چھین لی گئی تھی)۔ جُرم کی راہ میں شرم و ندامت ہی تو ایک رکاوٹ ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا موجودہ طریقِ کار بڑے اہتمام سے یہ رکاوٹ راستے سے ہٹا دیتا ہے۔

یہاں یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھئے کہ مجسٹریٹ کو ابھی میرے الزام کی نوعیت کا بھی علم نہیں تھا، اور مجھے انتہائی شرمناک سزا ملنی شروع ہو گئی تھی۔

ایک نفسیاتی انقلاب

مجھے جب شرم و ندامت اور ہتھکڑیوں کے خوف سے آزاد کر دیا گیا، اور ذلّت و رسوائی اور غلیظ کمرے میں بند رہنے کا عادی بنا دیا گیا تو میں نے دیکھا کہ میں وہ پُل عبور کر آیا تھا جسے اکثر انسان عبور کرتے لرز اٹھتے ہیں اور پیچھے ہٹ آتے ہیں۔ اس پُل کے اُس پار وہ دنیا آباد ہے جسے جرائم پیشہ لوگوں کی زمین دوز دنیا کہا جاتا ہے۔ وہاں انسان ہر مذہبی اور معاشرتی بندھن سے آزاد ہو جاتا ہے۔ وہاں زندگی کا چکر جُرم و جیل تک محدود ہو جاتا ہے، وہاں انتقام کے شعلے بھڑکتے رہتے ہیں اور وہاں اظہاریت کی راہیں مسدود نہیں ہوتیں۔ یہ وہ دنیا ہے، جس سے مہذب دنیا کے لوگ نفرت کرتے ہیں اور خوفزدہ رہتے ہیں۔

مجھے اس دنیا کے دروازے تک پہنچا دیا گیا تھا، میرے دل سے نفرت اور خوف دُور کر دیا گیا تھا۔ میں خوش تھا۔ اگر میں خوش نہ ہوتا، تو جن تاریک راہوں پر مجھے لے جایا جا رہا تھا، میں اُن تاریکیوں میں دَم گھُٹنے سے مر جاتا۔ میں نے ان تاریکیوں اور مراحل کی تلخیوں کو قبول کر لیا۔ یہی ایک راہ تھی نجات کی۔ میں دن رات رو رو کر، یا آہیں بھر بھر کر، اپنا خون پینا نہیں چاہتا تھا۔ کُڑھنے سے میں ہمیشہ گھبراتا رہا ہوں۔

زیرِ مقدمہ ملزموں کے متعلق یہ طریقِ کار، اور جرائم پیشہ دنیا کے مکینوں کی دلداریاں آڑے آئیں، اور میں نے اپنے آپ پر فتح پالی۔ یہ میری کامیابی تھی یا اُن سات جرائم پیشہ ملزموں کی فتح (یا ہمارے نظام کی شکست) کہ میرا اچھا بھلا دماغ جرائم پیشہ دنیا کے اسرار میں کھو گیا۔ پھر میں نے بھی قمیص اتار ڈالی، اور حوالات میں ہنستے کھیلتے، جرائم پیشہ لوگوں میں بیٹھ کر، ان کی فحش کلامی، گندہ گندہ قہقہوں اور جرائم سے بھرپور باتوں میں گھُل مل گیا۔ یوں لگا جیسے میری ایک

رگ کاٹ کر پرانا خون نکال دیا گیا ہے، اور میرے جسم میں نرالی قسم کا خون بھر دیا گیا ہے۔ میں اپنا سوشل معیار بھول گیا، تعلیم و تربیت بھول گیا، اور میرا دماغ جو نہ جانے کونسی بلندیوں پر اُڑا جا رہا تھا، پستیوں میں جا گرا۔ اس پستی میں گر کر میں خوش تھا۔ کیونکہ خوش رہنے کے سوا کوئی راہِ فرار نہیں تھی۔

بارگاہِ عدل میں دُوسری پیشی

میں اس وقت کس قدر "خوش" تھا جب مجھے دوسری بار عدالت میں لے جایا گیا۔ میری ڈاڑھی ایک انچ سے زیادہ بڑھ آئی تھی۔ بال بکھر بکھر کر پسینے اور گرد سے جم گئے تھے۔ آنکھیں بارہ روز نہ دُھلنے سے بے نُور ہو گئی تھیں۔ سفید بُش شرٹ اور پتلون فرش پر لیٹتے لیٹتے مٹیالی ہو کر بے حد غلیظ ہو گئی تھی۔ ناخن بڑھ آئے تھے، اور میری صُورت کریہہ المنظر بن گئی تھی۔ ایسے حلیے میں ہتھکڑی کس قدر بھلی لگتی تھی۔ عدالت کے اندر اور باہر کے ہجوم میں اب میں گویا سینہ تانے کھڑا تھا۔ اب میں ہجوم کو گھور رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دو تین آدمی جو قریب کھڑے مجھے دیکھ رہے تھے میری نظروں کا سامنا نہیں کر سکے تھے، سُکڑ کر ایک طرف ہو گئے تھے۔ اُن کی سہمی ہوئی نگاہوں میں میں نے نفرت کی جھلک دیکھی تھی، جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہے تھے ـــــ "چور۔ گرہ کٹ۔ اُٹھائی گیرا۔ اچھا ہوا پکڑا گیا" ـــــ اور میں نے سوچا کہ ان میں سے کسی ایک کی گردن دبوچ لوں، اس کی آنکھیں اُبل کر باہر نکل آئیں، اور ان آنکھوں میں رچی ہوئی نفرت کو نکال کر دم لوں، اور دوسرے روز یہ خبر سارے اخباروں میں چھپ کر سنسنی پھیلا دے کہ ایک ملزم نے دن دہاڑے قتل کر دیا۔ یہ میرا پہلا جرم تھا، سنگین جرم، جو میں نے سوچا۔ میرے خیالوں میں جرم سرایت کرتا جا رہا تھا۔ اُن خیالوں میں، جہاں اس سے پہلے جرم کے سائے تک نے بھی راہ نہ پائی تھی۔

جب مجھے مجسٹریٹ کے سامنے کھڑا کیا گیا، تو اُس کے چہرے پر بھی میں نے حقارت کے آثار دیکھے، جو پہلے روز نہیں تھے کیونکہ پہلے روز میری بُش شرٹ اور پتلون صاف ستھری تھی اور چہرہ بغیر ڈاڑھی کے تھا، دُھلا دُھلایا۔ اب بارہ روز بیت الخلاء میں بند رکھ کر جب مجھے مجسٹریٹ کے سامنے کھڑا کیا گیا تو وہ جیسے استغاثہ کی شہادت سُنے بغیر ہی یقین کرنے لگا تھا کہ میں مجرم ہوں۔ میرا حلیہ میرے خلاف قابلِ یقین شہادت تھا۔ میرے دانت جو بارہ روز صاف نہیں ہوئے تھے زرد پیلے ہو گئے تھے۔ یوں لگتا تھا، جیسے میں جرم پیتا رہا ہوں۔ پہلے روز مجسٹریٹ کو دیکھ کر میں نے سر جھکا لیا تھا، اور اب کے میں نے اُسے گہری نظروں سے دیکھا۔

مجھے اپنی گرفتاری کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ نہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں بے گناہ تھا یا گنہگار۔ مجھے فردِ جُرم کے خلاف بھی کوئی گلہ نہیں، اور نہ ہی میں آپ بیتی سُنا رہا ہوں۔ میں جگ بیتی سُنا رہا ہوں۔

میں کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ ہمارے حوالات اور جیل خانے کسی ایسے ہسپتال سے ملتے جلتے ہیں جس کے وارڈوں

میں تمام نوع کے مریض ایک ہی جگہ رکھے ہوئے ہوں ـــــ دِق کے مریض۔ جلدی امراض کے مریض، آتشک و سوزاک کے مریض، چیچک کے مریض، انفلوئنزا کے مریض، اور معمولی زخم و چوٹ کے مریضوں کو بھی انہی مریضوں میں رکھا ہوا ہو۔

حوالات کے متعلق مجھے ابھی بہت کچھ اور کہنا تھا، لیکن بات طویل ہے۔ یہاں سے میں جیل پہنچ جاتا ہوں۔

جیلوں کی کیفیت

ہتھکڑیوں، حوالات اور عدالتوں کے چکر میں جب انسان کو مکمل طور پر ذلیل کر دیا جاتا ہے تو اُس کی خوش قسمتی کہ بَری ہو جائے، ورنہ وہ جیل پہنچا دیا جاتا ہے۔ جب وہاں پہنچتا ہے تو اُس کی حالت کیا ہوتی ہے؟

مجھے جب اسیروں کے انبوہ میں پھینکا گیا تو پہلے ہی روز مجھے آوازیں سُنائی دینے لگیں ـــــ "خدا کو یاد کرو، گھر سے تسبیح منگوا لو، ڈاڑھی رکھ لو، وظیفے کرو" ـــــ ابتلا کے دَور میں خیال آیا کہ خدا کی یاد کے بغیر زندہ رہنا محال ہے۔ روح کچلی جا رہی تھی، اعصاب ریزہ ریزہ ہو رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو ایسے جہاز میں سوار پایا، جس کے ہر طرف کھائیاں کھودی جا رہی تھیں، طوفانِ باد و باراں کی چیخیں اور تھپیڑے قیامت بپا کر رہے تھے، اور بے رحم موجیں اُٹھ اُٹھ کر جہاز کو دبوچ رہی تھیں۔ جہاز ڈوب رہا تھا۔ اس قیامت میں آوازیں ہی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں ـــــ "خدا کو یاد کرو۔ خدا کو یاد کرو"

جیل میں صرف عادی مجرم نہیں ہوتے، وہاں وہ بھی ہوتے ہیں جو میری طرح پہلی بار قید ہوئے ہوں۔ جنہیں اتفاقیہ یا FIRST OFFENDERS کہا جاتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ چوری چکاری میں ہی قید ہوئے ہوں۔ ان میں میں نے ایسے بھی دیکھے، جنہیں صرف سزا ملی تھی، خطا کا اُنہیں علم نہ تھا۔ میرے سامنے سوسائٹی کی لغزشوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ ان میں سوسائٹی کی لغزشیں بھی تھیں، فرد کی بھی۔ اور ایسی لغزشیں بھی تھیں جن کا ذمہ دار کوئی اور تھا مگر تھوپی کسی اور کے سر گئی تھیں۔ مجسّم لغزشیں صبح و شام، دن رات، چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، خدا کو یاد کر رہی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے انسان تنکوں کے سہارے تلاش کر رہے تھے۔

آخری سہارے

انسان جب حالات اور اپنے آپ سے شکست خوردہ ہو جاتا ہے، تمام سہارے اور پناہ گاہیں چھن جاتی ہیں، اور جب اپنی ہی ذات لعن و طعن شروع کر دیتی ہے تو وہ ہر طرح کے سہارے قبول کر لیتا ہے۔ اور جب مولوی کا وعظ اور روایات باقاعدگی سے جیل پہنچ رہی ہوں تو وہ اِن "سہاروں" سے منکر ہو کر اپنی عاقبت بھی کیوں خراب کرے؟

جیل میں قیدی کی بے بسی انتہا پر ہوتی ہے۔ اپنا ضمیر اُسے کوس رہا ہوتا ہے، اس کا وقار، آزادی اور سکون چھن جاتا

ہے۔ اور اُسے یاد آتا ہے کہ اُسے ہتھکڑیاں پہنا کر بازاروں اور سڑکوں پر گھسیٹا جاتا رہا ہے اور وہ ذلّت کی گہرائیوں تک پہنچا دیا گیا ہے۔ جن کا سزا کے ساتھ دُور کا بھی تعلق نہ تھا۔ سزا تو اب شروع ہوئی ہے۔

سزا بطورِ اصلاح یا بجائے انتقام؟

یہاں میں سزا کے متعلق دو چار باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ ہمارے ہاں سزا میں اصلاح کی بجائے انتقام کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ مجرم کو پابجولاں اور بے بس کر کے انتقام لیا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی فطرت نے اس جذبہ کو کبھی قبول نہیں کیا۔ اگر قبول کیا ہے تو چیلنج کے طور پر قبول کیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ انتقام، مظلوم کا انتقام ظالم کے خلاف نہیں ہوتا۔ اس کی تو نوعیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ انتقام، اُن کی طرف سے ہوتا ہے جن کے سپرد مجرم کو کر دیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ اس سے کس بات کا انتقام لیتے ہیں؟ اگر مجرم ان کے کسی قاعدے قانون کو توڑے تو پھر بھی ان کے انتقام کی لِم قابلِ فہم ہو سکتی ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ وہاں ہر اُس شخص کے خلاف انتقام کا جذبہ موجزن ہوتا ہے جسے اُن کی تحویل میں دیدیا گیا ہو۔ مجھے ایسا نظر آتا تھا، گویا وہ لوگ قیدی کو ستا کر خوش ہوتے ہیں۔

یہ زمانۂ قدیم کی بات ہے، جب مجرم کو "PAIN —PLEASURE PRINCIPLE" پر سزا دیجاتی تھی۔ ایک صدی پہلے انگلینڈ میں جیب تراشی کی سزا پھانسی تھی، مجرم کو سرِعام پھانسی چڑھایا جاتا تھا۔ تماشائیوں کا ہجوم جمع ہوتا تھا، اور جب یہ ہجوم پھانسی چڑھتے انسان کو دیکھنے میں محو ہوتا تھا تو کئی جیبیں کٹ جاتی تھیں۔

جب ہم اپنے بچے کو مارتے ہیں تو وہ روتا چیختا ضرور ہے، لیکن یہ اعتماد کہ ماں باپ مجھ سے پیار بھی کرتے ہیں اس میں انتقامی جذبہ پیدا ہونے نہیں دیتا، اور ایک نہ ایک دن وہ اس حرکت سے باز آ ہی جاتا ہے جس پر اُسے پیٹا گیا تھا۔ لیکن جیل کے مکین وہ بچے ہیں جو پیار سے محروم ہیں۔ انھیں صرف سزا ملتی ہے، پیار نہیں۔ پیار سے محروم انسان بالعموم ایسی راہوں پر چل نکلتا ہے جسے ہم جرم کہتے ہیں۔

خدا کی یاد، اور اُس کے مختلف تصوّرات

اپنے آپ سے اور سوسائٹی سے دھتکارا ہوا یہ انسان بے بس ہو کر اُس عظیم قوت کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ وہاں عام طور پر خدا نیا پاتا ہے۔ میری اپنی کیفیت یہی تھی۔ قیدیوں نے مجھے اُن کے تصوّر کے خدا کو یاد کرنے کے اتنے طریقے بتائیے کہ میں حقیقی خدا کو یا بھولنے لگ گیا۔ میں پہلے روز نماز پڑھنے لگا تو اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ نے وہ تاثر پیدا ہی نہ کیا جو مجھ پر اکثر طاری ہو جایا کرتا تھا۔ میں اُس وقت اپنے خدا سے ہمکلام ہوتا تھا، اُس خدا سے جو مجھے پرویزؔ صاحب نے دکھایا تھا (اور جسے میں نے بہت ہی قریب سے دیکھا تھا) لیکن جیل میں جس خدا سے مخاطب

ہوا تو شک ہونے لگا جیسے میرا اپنا خدا آہنی سلاخوں سے باہر رہ گیا ہے (معاذ اللہ) گردوپیش کے درد، وظیفوں، تسبیحوں اور حق اللہ ہو کے دھماکوں میں دب گیا ہے۔ گردوپیش کی آوازیں بہت بلند تھیں۔ ہر طرف ان گنت خدا تھے، اور ہر خدا کی کرامات الگ تھیں، اور ہر خدا کا خالق کوئی مولوی، کوئی پیر، کوئی سائیں، کوئی فقیر تھا۔ اور ایک خدا ایسا بھی تھا جس کا خالق ایک مولوی نہیں، سینکڑوں ہزاروں مولوی تھے، جو ایک جماعت کی صورت میں منظم ہیں (اور ان کے خیالات منتشر ہیں)۔

ایک خدا تسبیح کے دانوں پر حاضر ناظر ہوتا تھا۔
ایک خدا سوا لاکھ مرتبہ یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ کہنے سے سامنے آتا تھا۔
ایک خدا سورۂ یٰسٓ کی "مُبِیْنُوں" سے رام ہوتا تھا۔
ایک خدا چالیس روز نمک نہ کھاؤ تو دکھائی دیتا تھا۔
ایک خدا گوشت نہ کھاؤ تو مراد سنتا تھا۔
ایک خدا ایسا تھا جو جب تک سائیں کادان والے کا تعویذ گلے میں نہ لٹکاؤ بات ہی نہیں سنتا تھا۔
ایک خدا جب تک ڈاڑھی نہ رکھو واقف ہی نہیں بنتا تھا۔
ایک خدا رات کے وقت حق اللہ ہو، حق اللہ ہو کی دھماکہ نما آوازوں پہ آسمان سے اترتا تھا۔

ذہن انسانی، یا یوں کہئے کہ انسان کے کمزور اعصاب کے ان خود ساختہ باطل کے خداؤں میں سے مجھے ایک بادہ اچھا لگا۔ اس کا سراغ یوں ملا کہ ایک رات میرے بستر سے ذرا پرے سے انتہائی سُریلی آواز آنے لگی، جیسے کوئی دھیمے دھیمے سُروں میں سپیرے کی بین بجا رہا ہو۔ زنداں کی رات کے مقید سکوت میں یہ آواز وجد آفریں تھی۔ میں اٹھ بیٹھا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ یہ بین نہیں تھی، بلکہ ایک قیدی تسبیح پہ کوئی ورد کر رہا تھا، وہ گنگنا رہا تھا۔ آواز ناک سے نکل رہی تھی۔ اس آواز میں الفاظ کم، سُر اور ترنم زیادہ تھا، لیکن تھا بہت خوب۔

دوسری صبح میں نے اُس سے پوچھا، تو اُس نے بتایا کہ وہ "یَاقَہَّارُ یَاجَبَّارُ، یَاعَلِیؓ مشکل کُشا" کا وظیفہ کر رہا تھا۔ یہ وظیفہ اُسے گاؤں کے مولوی صاحب نے "بمع اجازت" لکھ بھیجا تھا، اور یہ بھی کہ "اس وظیفے نے قاتل پھانسی کے تختے سے اتار لیے تھے"۔ مولوی صاحب نے اُسے بتایا تھا کہ ساتویں رات اُسے خواب میں خدا کا جلوہ نظر آئے گا اور خدا خود اُسے خوشخبری سنائے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ خدا قیدی کو نظر نہ آیا۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں تھا۔ اُسے خدا سے زیادہ مولوی پہ بھروسہ تھا۔

یہ تمام خدا مولویوں اور پیروں فقیروں نے قیدیوں کے رشتہ داروں سے منہ مانگی قیمت لے کر جیل میں بھیجے ہوتے ہیں۔ ان خداؤں سے بے شمار روایات وابستہ ہیں، اور ان کے معجزے اور کرامات ان گنت۔ میں نے ان خداؤں

کی ایک کرامت دیکھی ہے۔ وہ یہ کہ قیدی ایک فریب میں الجھ کر سزائے قید بڑے مزے سے کاٹ لیتا ہے۔ وہ ہر صبح رہا ہونے کی توقع لیکر جاگتا ہے، اُمید کے نشے میں دن بھر مشقت کرتا رہتا ہے۔ اور رات یہ اُمید لے کر گہری نیند سو جاتا ہے کہ خواب میں خدا کا جلوہ نظر آئے گا۔ اُسے وہ خدا نظر نہیں آتا نہ اس کا معجزہ، لیکن قیدی اُس کے وِرد و وظیفے سے تھکتا نہیں، اُکتاتا نہیں، مایوس نہیں ہوتا۔ اگر مایوس ہو بھی جائے تو باہر سے خدا کے خالق کا پیغام آجاتا ہے کہ یہی وظیفہ ایکبار پھر کرو۔

یہاں ایک مولوی صاحب کے تراشیدہ خدا کے معجزہ کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ایک قیدی عجیب و غریب قسم کا وِرد کرتا رہتا تھا جو اُسے ایک مولوی صاحب نے لکھ بھیجا تھا۔ قیدی نے مولوی صاحب کی کرامات کا ذکر جھوم جھوم کر کیا۔ کہنے لگا ــــــ "میرا بڑا بھائی پچھلی جنگ میں برما فرنٹ پر گیا ہوا تھا۔ میری ماں نے مولوی صاحب سے کتاب منگوائی تو مولوی صاحب نے کہا۔ غم نہ کر بڑھی! تیرا بیٹا مجھے اچھا بھلا نظر آرہا ہے، وہ آجائے گا، وہ گولی سے نہیں مرے گا۔ .... یقین کرنا بابو! کہ وہ گولی سے نہیں مرا تھا۔"

میں نے پوچھا کہ وہ زندہ لوٹ آیا تھا؟ قیدی بولا۔ "جی نہیں وہ جاپانیوں کے برستی بم سے مارا گیا تھا، پر گولی سے نہیں مرا تھا۔"

بھائی مر گیا، لیکن غلط عقیدہ زندہ ہے۔ لیکن آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اس طوفانِ بدتمیزی سے یکسر غیر متاثر رہا ہوں! مجھے اس کا اقرار ہے کہ میری اپنی بے بسی اور گردوپیش میں ان خداؤں کو ماننے والوں کی آوازوں نے میرے سامنے رکھے ہوئے "طلوعِ اسلام" کے پرچوں، اور جناب پرویز صاحب کی کتابوں کے الفاظ دھندلانے شروع کر دیئے تھے۔

مذہب پرست سیاسی لیڈر کی داستان

ممکن تھا کہ میں ان کے فریب میں آجاتا اگر میں اپنے حقیقی خدا کو اپنے سامنے نہ دیکھ لیتا۔ یہ اس طرح ہوا کہ ایک سیاسی پارٹی کے سکرٹری، پارٹی فنڈ کے غبن کے جرم میں ساڑھے تین سال سزائے قید لیکر آئے۔ عمر غالباً ستر کے لگ بھگ ہوگی۔ سفید لمبی ڈاڑھی، اور باتوں میں مذہب ہی مذہب۔ اس بزرگ کو سُوت کے گولے بنانے پر لگایا گیا، اور انہی کی عمر کے ایک جرائم پیشہ بوڑھے کی شاگردی میں بٹھا دیا گیا۔ میں نے پہلے روز دونوں کو اکٹھے بیٹھے دیکھا تو منظر بڑا ہی بھلا لگا۔ ایک عمر، ایک لباس اور ایک کام۔ فرق یہ تھا کہ شاگرد عالم فاضل تھا اور استاد عادی مجرم۔

میں ان کے پاس بیٹھا۔ اپنا تعارف کرایا تو عالم نے بات اس فقرے سے شروع کی ــــــ "میں بے گناہ ہوں، میں نے غبن نہیں کیا تھا۔" ــــــ اس تمہید کے بعد انھوں نے بتایا کہ وہ مذہب کے موضوع پر تین چار کتابیں لکھ چکے ہیں اور اب ایک کتاب انگریزی میں لکھ رہے تھے کہ گرفتار کر لئے گئے۔ اب بات جو چلی تو وہ بات بات میں آیاتِ قرآنی کے حوالے دینے لگے، اور بات بات میں حدیث سُنانے لگے، اور چند فقروں کے بعد یہ فقرہ کہ "میں بے گناہ ہوں"

اس طرح کہتے جیسے یہ بھی قرآن کی کوئی آیت یا کوئی حدیث تھی۔

پھر بات ورد اور وظیفوں پر آئی تو وہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں ورد اور وظیفوں کے حق میں وعظ کہنے لگے۔ قرآن خوانی کے متعلق انھوں نے کہا کہ۔ "میں جب قرآن پڑھتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں خدا سے براہ راست باتیں کر رہا ہوں۔ اور اب میں ایک وظیفہ شروع کرنے والا ہوں۔ آپ دیکھنا کہ میں کس طرح جیل سے نکلتا ہوں۔ میں بے گناہ ہوں۔"

اس عالم بزرگ کا وعظ جاری تھا کہ اُن کا ساتھی جرائم پیشہ مسکرا اُٹھا۔ اُس نے بڑے پیار سے اپنا ہاتھ عالم کے کندھے پر رکھا اور بولا ــــ "بڑے میاں! ایک بات کہوں، بُرا نہ جانو تو" ــــ وعظ کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ بوڑھا مجرم بولا۔ "میں جاہل گنوار ٹھہرا، چور اچکا اور غنڈہ۔ نہ قرآن جانتا ہوں نہ حدیث۔ پر اتنا جانتا ہوں کہ آپ آج رات، جب سب قیدی سو جائیں تو خدا کے حضور میں صرف ایک سجدہ کر کے کہہ دیں کہ یا خدا میں نے یہ گناہ کیا ہے، تو بخش دے۔ آئندہ ایسا نہیں کروں گا، اور وہ بخش دیگا۔ میں یہ بھی بتا دوں کہ خدا ساڑھے تین سال سے پہلے جیل کا دروازہ آپ کے لئے نہیں کھولے گا۔ وہ اس سزا میں بھی تخفیف نہیں کرے گا جو آپ کو یہاں مل رہی ہے، لیکن اس اعترافِ خطا سے وہ اس جرم کی سزا کو بخش دے گا جو آپ یہ کہہ کر اپنے خلاف کرتے رہتے ہیں کہ میں بے گناہ ہوں۔ حالانکہ آپ بے گناہ نہیں۔"

بوڑھا مجرم میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ عالم کا وعظ لڑکھڑا گیا تھا۔ چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی ڈاڑھی کے ایک ایک بال سے ایک ایک تنکا جھڑ رہا ہے۔

بوڑھے جرائم پیشہ نے اُسی پیار بھرے انداز سے ہاتھ میرے کندھے پر رکھا، اور مسکرا کر بولا۔ "بیٹا! تو برس کی عمر میں پہلی جیب کاٹی تھی۔ آج عمر ایک کم اسّی ہوگئی ہے۔ جیبیں کاٹتے اور تالے توڑتے عمر گزار دی ہے، اللہ قسم نہ اُس وقت جھوٹ بولا تھا، نہ آج بولتے ہیں۔ جو پوچھتا ہے، ہم کہتے ہیں مجرم ہوں بھائی! گناہگار ہوں۔ یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ اسکے بعد پھر کیوں جرم کے لئے آمادہ ہو جاتا ہوں، لیکن میں نے خدا کے سامنے جھوٹ بول کر کبھی اُسے فریب دینے کی کوشش نہیں کی۔ اور میرا خیال ہے کہ خدا اور سب کچھ بخش دیتا ہے، لیکن یہ جرم نہیں بخشتا۔

اب عالم کا چہرہ خفت اور ندامت کے تاثرات سے یکسر بدلا ہوا تھا۔ بوڑھے جرائم پیشہ کی مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ اور اس مسکراہٹ میں مجھے حقیقی خدا نظر آیا۔ اُس بوڑھے نے خدا کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور وہ بغیر تسبیح اور وظیفے کے اس خدا سے ہمکلام رہتا تھا ــــ پیار و محبت کی زبان میں ــــ تمام جرائم پیشہ قیدی اُسے "باپ" کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ اور صحیح معنوں میں کارسمانی باپ تھا۔

مجرم کا حقیقی خدا

یہاں اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اُسے کیا خاک خدا نظر آتا ہوگا جس کی تمام عمر گناہوں میں گذر گئی تھی۔ اس کے جواب میں

مجھے اس بوڑھے کی ساری داستان سُنانی پڑے گی، جو بہت طویل ہے اور بہت تلخ۔ اس کے دو چار فقروں سے سمجھ لیجئے۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا۔ "بابا! تم نے شادی تو کی ہوگی؟" بولا۔ "بیٹا! کچھ یاد نہیں"۔ میں نے پوچھا "بچے ہیں؟"۔ کہنے لگا۔ "یہ سب میرے بچے ہیں، یہ تمام جیب کترے، اٹھائی گیرا اور جرائم پیشہ ...... اور بیٹا! تم پڑھے لکھے ہو جانے کیا سمجھو، یہ اپنا ایمان ہے کہ میں کوٹھے پر بیٹھی ہوئی رنڈی کو بھی بیٹی کہا کرتا ہوں، کیونکہ اُسے بیٹی کہنے والا کوئی نہیں۔ نہ کوئی یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ کس طرح مجبور ہو کر وہاں آبیٹھی ہے"۔

گناہوں کے باوجود اس کی مسکراہٹ میں بیساختگی اور ایک گونہ پاکیزگی تھی۔ اور اس کے مقابلہ میں عالم فاضل بزرگ مسکراہٹ سے ہی محروم تھا۔ اس کا ضمیر اُسے TORTURE کرتا رہتا تھا۔ چند روز بعد پتہ چلا کہ اُس نے جیل میں ایک اور "خدا" تخلیق کر لیا ہے، اور چند ایک قیدی اس کے پیچھے چل پڑے ہیں۔

ان خداؤں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ قیدی اُس عظیم قوت کو (جو حقیقی خدا ہے) اور اپنے جرم کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اصلاح سے محروم رہتا ہے۔ جب اُسے کہا جاتا ہے کہ تم نے بڑا سنگین جرم کیا ہے تو وہ نہایت اطمینان سے جواب دیتا ہے ـــ "خدا کو یہی منظور تھا" ـــ "یہ منظوری" اُس خدا کے سر تھوپی جاتی ہے جو حقیقی خدا ہے۔ بعد کا کام دوسرے خدا کرتے ہیں۔

جب قیدی رہا ہوتا ہے تو وہ بالکل ہی تھکا ہوا ہوتا ہے، معاشرہ اُسے دھتکار چکا ہوتا ہے، اپنے آپ سے وہ بدظن ہو چکا ہوتا ہے، جیل اُس کے اعصاب پر سوار ہو چکی ہوتی ہے، سزا کا انتقامی جذبہ اُسے بے حال کئے ہوئے ہوتا ہے وہ تھک ہار کر خدا کے حضور جھکنا چاہتا ہے تو اُسے ان گنت خدا کھڑے نظر آتے ہیں، اور کام ایک بھی نہیں آتا۔

یہ روئیداد بہت طویل ہے۔ میرا مشاہدہ ایک یا دو دن کا نہیں، پورے دو سال کا ہے۔ اسے سنانے کے لئے دو ہی سال چاہئیں۔ یہ تو ذرا سی جھلک ہے، جو میں نے آپ کے سامنے پیش کی ہے۔ میں یہ ساری روئیداد کتابی صورت میں لکھ رہا ہوں، اور انشاءاللہ بہت جلدی آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ میں اس کتاب میں اٹھائی گیری سے عصمت فروشی اور مذہب فروشی تک کے جرائم کا پس منظر زندہ مثالوں سے واضح کر رہا ہوں۔

میرا پیش نہاد

لیکن واضح کس لئے کر رہا ہوں؟ صرف اس لئے کہ اس دھتکارے ہوئے ہجوم میں بیشتر ایسی روحیں ہوتی ہیں جو ذرا سی کوشش سے ہمارے معاشرہ کا بہترین، مفید ترین اور حسین ترین جزو بن سکتی ہیں۔ لیکن یہ اس صورت میں ممکن ہے، جب ہمارا نظام عدل و سزا، قرآنی خطوط پر متشکل ہو جائے۔ جس میں حتی الامکان کوئی بے گناہ سزا نہ پائے۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ نفرت مجرم سے ہو، جس انسان سے وہ جرم سرزد ہوا ہے، اُس سے نفرت نہ ہو۔ خدا نے جب کہا ہے

بقیہ صفحہ ۹۱ پر دیکھئے

حضرت عمرؓ کا طریقِ شوریٰ

(مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی)

حضرت عمرؓ سے پہلے معمول یہ چلا آرہا تھا کہ مفتوحہ زمینیں بھی مالِ غنیمت کی طرح مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ نے اس معمول میں تبدیلی کرنی چاہی کہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم کرنے کی بجائے حکومت کی تحویل میں رکھی جائیں۔ اس تجویز کی مخالفت بھی ہوئی، لیکن آخر الامر حضرت عمرؓ کو کامیابی ہوئی۔ اس مرحلہ کی تفصیل ذیل کے مضمون میں بیان کی گئی ہے، جسے ہم ماہنامہ "میثاق" کی اپریل ۱۹۶۱ء کی اشاعت سے شکریہ کے ساتھ نقل کرتے ہیں۔ اس سے یہ اہم اصول سامنے آجاتا ہے کہ اسلامی حکومت میں حالات کی تبدیلی سے سابقہ فیصلوں میں تبدیلی کی جا سکتی ہے، بشرطیکہ وہ تبدیلی قرآن کی حدود سے نہ ٹکرائے۔ (طلوعِ اسلام)

سلطنتِ کسریٰ کی فتح کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ایک سخت پیچیدگی اور دشواری کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ مفتوحین کے مال و دولت، یعنی زر و جواہر، گھوڑے اور دوسرے جانوروں کی طرح غازیوں نے اُن کی زمینوں کو بھی مالِ غنیمت کی حیثیت دی اور حکومت سے ان پر قبضہ حاصل کرنے کی اجازت چاہی۔ اموال کے متعلق تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قرآنی تصریح کے مطابق فیصلہ کیا کہ خمس نے کر بقیہ چار حصے مجاہدین میں بانٹ دیئے جائیں:۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ اِنْ کُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰہِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ (۸:۴۱)

"اور جان لو کہ جو تم کو غنیمت کے قسم کی چیز ملی ہے، اس کا پانچواں حصہ اللہ، رسول کے قرابت داروں یتیموں، محتاجوں اور مسافروں کے لیئے ہے۔ اگر تم اس چیز پر ایمان رکھتے ہو جو ہم نے اپنے بندے پر، حق و باطل کے فیصلے کے دن اتاری، جس دن کہ دونوں لشکروں میں مڈبھیڑ ہوگئی اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے"

زمین کے متعلق ان کا خیال تھا کہ اسے تقسیم کرنے کی بجائے حکومت کی ملکیت میں دیدیا جائے، اور پرانے مالکوں کے قبضہ

میں اسے باقی رکھ کر اُن سے اس کا خراج لیا جائے۔ یہ خراج کا مال سرحدوں اور مفتوحہ شہروں کے منتظمین اور محافظین پر صرف کیے جانے کے بعد عامۂ مسلمین میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن اکثر صحابہؓ نے اس رائے سے اختلاف کیا، کیونکہ اُن کے نزدیک زمین فئی کی حیثیت میں داخل ہے، اس لئے اسے مستحقین میں بانٹ دینا ہی بہتر تھا۔

مگر حضرت عمرؓ کا اندازِ فکر یہ تھا کہ مفتوحہ علاقوں میں محافظ پولیس متعین کرنا ضروری ہوگا، اور لامحالہ انھیں تنخواہیں دینی ہوں گی، اس لئے اگر زمین تقسیم کر دی جاتی ہے تو سرحدوں کی حفاظت کرنے والے سپاہیوں کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ مال و دولت کو ہیر پھیر کے صرف مالداروں کے پاس رکھنا پسند نہیں کرتا کہ وہی اس سے فائدہ اٹھائیں، اس لئے اگر فارس، عراق، شام اور مصر وغیرہ، دور دراز علاقوں کی وسیع زمینیں صرف چند ہزار صحابہ میں تقسیم کر دی جاتی ہیں تو وہ بیش بہا دولت و ثروت کے مالک ہو جائیں گے اور بعد میں مسلمان ہونے والوں کے لئے کوئی چیز باقی نہ رہے گی۔ اس صورتِ حال کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تو عیش کی فراوانی اور دولت کی بہتات ہوگی اور دوسری جانب شدید فقر و فاقہ اور عسرت و تنگی۔ اس صورت کو حضرت عمرؓ کا ذہن کسی طرح قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں تھا۔

جو لوگ حضرت عمرؓ کی رائے سے اختلاف رکھتے تھے ان کی تائید میں کتاب و سنت کے اشارات اور شواہد موجود تھے اس لئے وہ کہتے تھے کہ اس حلال ثروت کی گنجائش تو خود خدا نے دے رکھی ہے اس قسم کی زمین فئی کی حیثیت میں شامل ہے اور اس سے پیشتر خود آنحضرتؐ اسے تقسیم کر چکے ہیں۔

حضرت عمرؓ جب اس مسئلہ کی وجہ سے سخت پریشان تھے تو آپ نے صحابہؓ کے مجمع میں بتایا کہ سعد بن وقاصؓ نے عراق سے خط لکھا ہے کہ وہاں کے لوگ مالِ غنیمت اور فئی کی زمین تقسیم کرانے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔

بعض حاضرین:۔ "تو پھر آپ انھیں کیوں نہیں جواب دیدیتے کہ وہ فئی کی زمین تقسیم کر دیں"

حضرت عمرؓ:۔ "اگر زمین تقسیم کر دی جاتی ہے تو وہ وراثت میں باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی رہے گی اور آئندہ مسلمانوں کا نہ جانے کیا حال ہوگا۔ یہ بھی کوئی فیصلہ ہوا؟"

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ:۔ "آخر فیصلہ کیا ہوگا؟ زمین کی حیثیت فئی کے سوا اور کیا ہے؟"

حضرت عمرؓ:۔ "بیشک تمہارا کہنا ٹھیک ہے مگر میں اسے مناسب نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے آئندہ اس قسم کی فتوحات نہ ہوں گی اس لئے تمام مسلمانوں کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اور اگر زمین تقسیم کر دی جاتی ہے تو سرحدوں کی حفاظت کس طرح ہوگی۔ نیز مفتوحہ علاقوں کے غریبوں، محتاجوں، بیواؤں اور آئندہ نسلوں کا کیا بنے گا؟"

عام مجمع سے یہ صدا سنائی دیتی ہے کہ "فئی کو اللہ تعالیٰ نے ہماری تلواروں کی بدولت ہمیں بخشا ہے آپ انھیں جنگ میں شریک ہونے والوں اور اُن کی اولاد و احفاد کو کس طرح دے سکتے ہیں"

حضرت عمرؓ کو اس کیفیت سے سخت تردد اور حیرت ہوتی ہے اور وہ مہاجرین اوّلین اور پہلے پہل اسلام قبول کرنے

والے اکابر صحابہؓ سے اس معاملہ میں مشورہ کرتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف فرماتے ہیں:۔

عبدالرحمٰن بن عوفؓ:۔ "میری رائے میں لوگوں کا حق انہیں دیدینا چاہیئے"۔

علیؓ:۔ "امیرالمؤمنین! آپ کی رائے صائب ہے"۔

زبیر بن عوامؓ:۔ "نہیں، اللہ نے ہماری تلواروں کے ذریعہ جو فئی ہمیں دی ہے، اُسے تقسیم کر دینا چاہیئے"۔

عثمانؓ بن عفان:۔ "امیرالمؤمنین کا فیصلہ درست ہے"۔

بلالؓ:۔ "نہیں اور خدا کی قسم ہرگز نہیں۔ ہم خدا کے حکم کو اس کے بندوں پر نافذ کریں گے اور مالِ فئی مؤمنین میں تقسیم کر دینگے"۔

طلحہؓ:۔ "حق امیرالمؤمنین کی رائے کے ساتھ وابستہ ہے"۔

زبیرؓ:۔ "لوگو! خدا کی کتاب چھوڑ کر کہاں بھٹک رہے ہو"۔

عبداللہ بن عمرؓ:۔ "امیرالمؤمنین اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کیجئے۔ امید ہے، اس کے اندر امت کی بھلائی ہوگی"۔

بلالؓ:۔ (سخت غصہ میں بلند آواز سے) "خدا کی قسم اس امت پر کتابِ الٰہی اور سُنّتِ نبویؐ کے علاوہ کوئی دوسرا حکم نہیں نافذ کیا جاسکتا"۔

عمرؓ:۔ (انتہائی درد و کرب اور اضطراب کے عالم میں) "خداوندا، مجھے بلالؓ اور اُن کے ساتھیوں کے مقابلہ میں کافی بنا"۔

یہ سُن کر بحث و جدال تین دن تک گرم رہتا ہے۔ اور اس عقدہ کو حل کرنے میں لوگ سخت باتیں بھی کہہ دیتے ہیں۔ اسی اثنا میں حضرت عمرؓ کے دل میں یہ مبارک خیال پیدا ہوتا ہے کہ مجلس شوریٰ کو وسیع کر کے مہاجرین کے ساتھ انصار کو بھی اس میں شریک کر لیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے اوس و خزرج، ہر ایک سے ۵ ۔ ۵ اشخاص لئے اور ان کے سامنے اپنا مدّعا اس طرح بیان کیا۔

"حضرات! میں نے آپ کو اس لئے زحمت دی ہے کہ جو امانت اور ذمہ داری آپ نے میرے سپرد کی ہے۔ اس میں میرا تعاون کریں اور ہاتھ بٹائیں۔ میں بھی آپ کا ایک معمولی فرد ہوں، اور میری موافقت اور مخالفت کا حال آپ کو معلوم ہوگا۔ حاشا و کلّا، میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ میری خواہش کے مطابق رائے دیں اور میری منشا کی پیروی کریں۔ آپ کے پاس خدا کی کتاب موجود ہے۔ اور وہ حق کو واضح کرنے کے لئے کافی ہے۔ خدا کی قسم، جو بات میں نے کہی ہے اور جو چیز میں چاہتا ہوں، اُس سے بجز حق کے اور میرا کوئی مقصود و منشا نہیں ہے"۔

انصار:۔ "امیرالمؤمنین ارشاد ہو"۔

حضرت عمرؓ:۔ "آپ حضرات کو ان لوگوں کی بات معلوم ہو چکی ہے، جو سمجھتے ہیں کہ میں ان کے حقوق میں مداخلت اور ناانصافی سے کام لے رہا ہوں۔ ظلم و ناانصافی سے میں خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اگر واقعی میں نے ان کے ساتھ کوئی زیادتی کی ہو اور ان کا کوئی حق کسی دوسرے کو دیدیا ہو تو مجھ سے زیادہ بدبخت کوئی نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں دیانت داری کے ساتھ یہ سمجھ رہا ہوں کہ کسریٰ کی سلطنت کی فتح کے نتیجہ میں، جو اموال و اراضی ہمارے قبضہ میں آئے ہیں، اُن میں سے صرف

مالوں کا ۴/۵ حصہ مجاہدین کے درمیان تقسیم کیا جائے، لیکن زمین کو ان کے مالکوں کے قبضہ میں باقی رکھا جائے۔ تاکہ وہ اس کا خراج ادا کریں۔ آپ سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ سرحدوں پر محافظ دستوں کا رہنا ضروری ہے۔ اور بڑے بڑے شہروں شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر، ہر جگہ فوجوں کا رکھنا لازمی ہے۔ ان فوجیوں کی تنخواہوں کے لئے ایک معقول انتظام اور وظیفہ ناگزیر ہوگا۔ اس لئے اگر زمین تقسیم کر دی جاتی ہے تو ان لوگوں کے اخراجات کہاں سے پورے کئے جائیں گے"۔

تمام حاضرین:۔ (پُرجوش لہجہ میں) "آپ صحیح فرماتے ہیں۔ اگر سرحدوں اور شہروں میں فوجیں نہ رکھی گئیں تو یقیں مانیے اہلِ کفر پھر اُن پر مسلط اور قابض ہو جائیں گے"۔

حضرت عمرؓ کی زبان سے بارہا حق کی شہادت اور ترجمانی ہو چکی ہے اور اُن کے دل پر اکثر خدا نے حق کو القاء بھی کیا ہے۔ اس موقعہ پر بھی انہیں خدا نے بصیرت عطا کی۔ اُن کا ذہن نورِ الٰہی سے چمک اُٹھتا ہے اور فرماتے ہیں:۔ "مجھے کتابِ الٰہی سے اس کا ایک روشن ثبوت بھی مل گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ (۵۹/۷)

"اللہ نے اپنے رسول پر گاؤں والوں کا جو مال لوٹایا ہے، اُس میں اللہ، اُس کے رسول، رسول کے قرابتداروں یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا حصہ ہے، تاکہ وہ تمہارے اندر کے صرف مالداروں ہی کے درمیان گردش کرتا رہے اور رسول نے جو کچھ تمہیں دیا ہے، اُسے اختیار کرو، اور جس سے منع کیا ہے اُس سے باز رہو اور اللہ سے ڈرو، وہ سخت عذاب والا ہے"۔

اس کے بعد فرمایا:۔

لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۚ (۵۹/۸)

"(اس مال میں) ان محتاج مہاجرین کا بھی حصہ ہے جو اپنے گھروں اور اپنے مال و دولت سے محروم کر دیئے گئے ہیں۔ ان لوگوں کو اللہ کا فضل اور اسکی رضامندی مطلوب ہے اور وہ اللہ اور اسکے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ بلاشبہ یہ لوگ (ایمان میں) سچے ہیں"۔

اور اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے، بلکہ ان لوگوں کے ساتھ انصار کو بھی شامل کیا گیا ہے:۔

وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُو الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۚ (۵۹/۹)

"(فئی میں اُن لوگوں کا بھی حصّہ ہے) جو پہلے سے (مدینہ میں) رہتے ہیں اور اُن کا ایمان خالص ہے اور وہ مہاجرین سے محبّت رکھتے ہیں، اور اُن کے دلوں میں اس چیز کی ذرا بھی طلب نہیں پیدا ہوتی جو مہاجرین کو دیہ یا جاتا ہے، بلکہ وہ اپنی احتیاج کے باوجود اُنھیں اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں۔ اور جو لوگ بخالتِ نفس سے محفوظ ہوں، وہی فی الواقع اصلی کامیاب ہیں۔"

پھر اسی پر بس نہیں کیا۔ بلکہ بعد میں آنے والے دوسرے لوگوں کو بھی شریک کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:-

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَ لِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا
بِالْاِيْمَانِ وَ لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (۹ :۵۹)

"اور جو لوگ اُن کے بعد آئے وہ خدا سے دعا کرتے ہیں، پروردگار ہمیں اور ہمارے ان بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کی طرف سے کوئی کینہ نہ پیدا ہو۔ پروردگار! بیشک تو نہایت شفیق اور مہربان ہے۔"

یہ آیت بعد میں آنے والوں کے لئے بھی عام ہے۔ اس لئے فئی کا حصہ سب کو ملے گا۔ ایسی صورت میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ کس طرح زمین تقسیم کردی جائے اور بعد میں آنے والے دوسرے لوگوں کو نظرانداز کردیا جائے۔"

تمام صحابہؓ اس فقہی نکتے کو سمجھ جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید میں ہر طرف سے آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ اس طرح ایک پریشان کُن مسئلہ نہایت عمدگی سے متفقہ طور پر حل ہو جاتا ہے۔

آپ نے غلط سمجھا ہے ....!

اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ لغات القرآن محض قرآنی الفاظ کی ڈکشنری ہے، تو آپ نے غلط سمجھا ہے۔ یہ ڈکشنری نہیں۔ اس میں

(۱)۔ تمام قرآنی الفاظ کے معانی، عربی زبان کی مستند کتبِ لغت اور خود قرآنِ کریم کی روشنی میں متعین کئے گئے ہیں۔ اتنے حصّہ کو آپ لغات کہہ سکتے ہیں۔
(۲)۔ قرآنِ کریم کی ان آیات کا مفہوم وضاحت سے بیان کیا گیا ہے جن میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حصّہ تفسیر القرآن کا ہے۔
(۳)۔ دین کے تمام بنیادی تصورات کو بڑی شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ حصّہ دین کی بنیادی تعلیم کا نصاب ہے۔
(۴)۔ شروع میں عربی زبان کے بنیادی قواعد و اصول بیان کئے گئے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ حصّہ عربی زبان کا معلّم ہے۔
(۵)۔ تمام قرآنی الفاظ کی ایک جامع فہرست ہے۔ ہر لفظ کے سامنے اس کا مادہ دیا گیا ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا انڈکس ہے۔

آپ ایک مرتبہ اس لغات کو شروع سے اخیر تک پڑھ جائیں تو قرآنِ کریم کے سمجھنے اور دین کے بنیادی اصولوں کو جاننے کے لئے آپ کو کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی

یہ ہے وہ کتاب، جسے آپ نے غلطی سے محض قرآنی الفاظ کی ڈکشنری تصور کر رکھا ہے
کتاب چار جلدوں میں بڑے پاکیزہ ٹائپ میں شائع ہوئی ہے
قیمت مجلّد
پہلی تین جلدیں:- پندرہ روپیہ فی جلد۔ چوتھی جلد۔ بارہ روپیہ فی جلد

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ــــــــ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

(بقیہ "لمعات" صفحہ ۸ سے آگے)

"میرے لئے یہ مشکل ہے کہ کنووکیشن ایڈریس کی حدود کے اندر ـــــ جن سے میں پہلے ہی تجاوز کر چکا ہوں ـــــ اس بات کو بالوضاحت بیان کر سکوں کہ طالب علموں کے دل میں یہ بات کیسے پیدا کی جائے کہ ان کی طرف سے ہر واقعہ کا ردِ عمل مطابقِ فطرت ہو۔ اس سلسلہ میں وہ تجویز قابلِ توجہ ہے جسے طلوعِ اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ یہ کہ ہماری درسگاہوں میں اسلامیات سے متعلق تعلیم کو اسلامی تاریخ اور دینیات کے مسائل تک محدود نہ رکھا جائے، بلکہ اس کے دائرے کو وسیع کیا جائے اور طالب علموں کو بتایا جائے کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اس کی نشوونما کے اصول کیا ہیں۔ وہ کونسی خصوصیات ہیں جو انسان کو حیوان سے متمیز کرتی ہیں۔ قانونِ مکافاتِ عمل کس طرح ہماری زندگی کے ہر گوشے کو محیط ہے۔ مختصراً، انہیں ان مستقل اقدار کی تعلیم دی جائے جو قرآن کریم میں منضبط و محفوظ ہیں۔"

(PAKISTAN TIMES 6 مئی ۶۷)

جو کچھ ہم نے سابقہ صفحات میں پیش کیا ہے، یہ اُسی تفصیل کا خلاصہ ہے۔ اس کے چار ہی دن بعد، محترم صدرِ مملکتِ پاکستان نے، ملک کی تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"انہیں چاہیئے کہ ایسے ہفتہ وار اجتماعات کا انتظام کریں جن میں قرآنِ کریم کا مطالعہ اس انداز سے کیا جائے کہ اس کی تعلیم کو ہماری روزمرہ کی عملی زندگی پر کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے۔"

اس سلسلہ میں انھوں نے کہا کہ

"جب تک ہم ایسے طریق معلوم نہیں کر لیں گے جن سے قرآنی احکام ہماری عملی زندگی پر منطبق ہو سکیں، ہم اس خلیج کو کبھی پاٹ نہیں سکیں گے جو نظری تعلیم اور ہماری عملی زندگی کے درمیان حائل ہے۔"

(PAKISTAN TIMES 10 مئی ۶۷)

ظاہر ہے کہ اس کا بہترین ذریعہ طریقِ تعلیم میں وہ بنیادی تبدیلی ہے جس کا ذکر ہم نے گذشتہ اوراق میں کیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس وقت، سب سے مقدم کرنے کا کام یہ ہے کہ جو حضرات قرآنی اقدار کا صحیح اور واضح تصور اپنے سامنے رکھتے ہوں، ان پر مشتمل ایک مختصر سی کمیٹی بنائی جائے۔ جو طرق اور نصابِ تعلیم میں اس بنیادی تبدیلی کو عمل میں لانے کے لئے تجاویز پیش کرے، اور پھر حکومت ان تجاویز کو عملاً نافذ کرے۔ اس باب میں جتنی تاخیر کی جائے گی، ہماری خرابیاں اتنی ہی زیادہ بڑھتی جائیں گی اور ان کے مہلک اثرات اتنے ہی زیادہ گہرے ہوتے جائیں گے۔ چونکہ طلوعِ اسلام کی زندگی کا مشن ہی یہ ہے، اور اس ضمن میں اس نے کافی تحقیق کی ہے، (اور کر رہا ہے) اس لئے اگر اس سلسلہ میں اس کی خدمات کو مفید سمجھا جائے تو وہ انہیں بلا معاوضہ اور بخوشی پیش کر دے گا۔

ہم آخر میں اسے پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ مملکتِ پاکستان کے استحکام، اور ملّتِ پاکستانیہ کی فلاح و بہبود کے لئے ازبس ضروری ہے کہ ہم اپنی آنے والی نسلوں کو سنبھال لیں اور اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ ان کے قلب و دماغ کو قرآنی اقدار کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔ یہی ہمارے نظامِ تعلیم کا مقصد ہونا چاہیئے۔

(۳)

شروع اپریل میں طلوعِ اسلام کی پانچویں کنونشن منعقد ہوئی۔ اس کی پوری روئیداد اور تقاریر آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئیں گی۔ (افسوس ہے کہ پرویز صاحب کی اہم تقریر "اسلام ہی کیوں سچا دین ہے" گنجائش کی کمی کی وجہ سے اس اشاعت میں شامل نہیں کی جا سکی۔ اسے آئندہ پرچے میں شائع کیا جائے گا۔) طلوعِ اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے، بغیر کسی مذہبی فرقہ یا سیاسی پارٹی بنائے، قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی منظم شکل میں کوشش کی۔ اور مقامِ مسرت ہے کہ اس کی یہ کوشش دن بدن بار آور ہوتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو کنونشن کی روئیداد سے ہو سکیگا۔ اس مرتبہ ایک نئی خصوصیت 'بزمِ خواتین' کا اجلاس تھا، جو ہماری توقعات سے کہیں زیادہ کامیاب رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہماری خواتین قرآن کریم کی صحیح تعلیم کو اپنا لیں تو معاشرہ کی اصلاح بڑی آسان ہو جائے۔ طلوعِ اسلام اس باب میں بھی امکان بھر کوشش کر رہا ہے۔

جس طرح ——— "تاج محل"
آج بھی اسی طرح تر و تازہ اور شگفتہ و شاداب ہے، جس طرح آج سے تین سو سال پہلے، اسی طرح بعض کتابیں بھی زندہ رہنے والی ہوتی ہیں اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ان کی قدر و قیمت بڑھتی جاتی ہے۔ اسی قسم کی کتابیں، محترم پرویز صاحب کی زندۂ جاوید تصانیف
انسان نے کیا سوچا؟
سلیم کے نام خطوط - [illegible] قیمت جلد اوّل آٹھ روپے۔ جلد دوم چھ روپے۔ جلد سوم چھ روپے
انسان نے کیا سوچا؟ :- بڑی تقطیع۔ پونے پانچ سو صفحات۔
قیمت :- بارہ روپے
سلیم کے نام خطوط
اب جوں جوں دن گزرتے جاتے ہیں ان کی مقبولیت بڑھتی جاتی ہے۔ ان کتابوں نے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں صحیح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔
انسان نے کیا سوچا؟ :- انسانی فکر کی دو ہزار سال کی تاریخ ہے [illegible]
[illegible] اس قسم کی کتاب نہیں ملے گی۔
سلیم کے نام خطوط [illegible] دونوں کتابیں [illegible] میں چھپی ہیں۔
میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

صدرِ مملکت پاکستان نے، ملک کی یونیورسٹیوں کے وائس چانسلروں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ایسے ہفتہ وار اجتماعات کا انتظام کریں جن میں قرآنِ کریم کا مطالعہ اس مقصد سے کیا جائے کہ قرآنی احکام کو زندگی کے عملی مسائل پر کس طرح منطبق کیا جا سکتا ہے۔

یہ سلسلہ آپ اپنے گھروں میں بھی شروع کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے بچوں کو قرآنی احکام سمجھائیے اور بتائیے کہ ان پر عمل کس طرح کیا جا سکتا ہے۔

اس کا سب سے سہل طریق یہ ہے کہ آپ اپنے بچوں کو

اسلامی معاشرت

سبقاً سبقاً پڑھائیں

جس میں نہایت سادہ زبان میں قرآنِ کریم کے ان احکام کو بیان کیا گیا ہے جن کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے۔ یہ کتاب ہر بچے، بوڑھے، عورت، مرد کے پاس ہونی چاہیئے۔

قیمت صرف دو روپے۔

شائع کردہ:-

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ، ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

ضمیمہ طلوع اسلام

بابت مئی - جون ۱۹۶۱ء

مفہوم القرآن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ ہمارے سنجیدہ، تعلیم یافتہ، طبقہ کا رُجحان قرآن کریم کی طرف ہو رہا ہے، لیکن انہیں شکایت یہ ہے کہ موجودہ ترجموں کی مدد سے قرآن کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا، اور تفاسیر، ایک تو بہت ضخیم ہوتی ہیں، اور دوسرے ان میں بہت کچھ غیر قرآنی ہوتا ہے۔

محترم پرویز صاحب، کہ جن کی ساری عمر قرآن کریم پر غور و فکر میں گذری ہے، ایک مدّت تک اس مسئلہ پر غور کرتے رہے اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ قرآن کریم کا مفہوم اُس انداز سے سمجھ میں آسکتا ہے جسے انگریزی میں پیرا فریز (Paraphrase) کہتے ہیں۔ چنانچہ اُنہوں نے سالہاسال کی محنت کے بعد اس انداز سے قرآن کریم کا مفہوم مرتّب کیا ہے۔ آئندہ اوراق میں، سورۂ بقرہ کی چند ابتدائی آیات کا مفہوم (بطور نمونہ) پیش کیا جاتا ہے۔ آپ اس کا بڑے غور سے مطالعہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے وہ دشواری رفع ہو جاتی ہے یا نہیں جسکا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

یہ مفہوم، اکثر مقامات پر، موجودہ تراجم سے مختلف نظر آئے گا ۔ سوال یہ ہے کہ اس کے صحیح ہونے کی سند کیا ہے؟ قرآن کریم کے سمجھنے کا طریق یہ ہے کہ اُس کے الفاظ کے معانی عربی زبان کی مستند کتب لغت سے متعین کئے جائیں، اور اس نے جو بات ایک جگہ کہی ہے اس کے دوسرے مقامات میں اس کی تشریح دیکھی جائے۔ مفہوم القرآن میں ان دونوں باتوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ اس میں قرآنی الفاظ کے مفہوم کی سند، پرویز صاحب کی لغات القرآن میں ملے گی (جو چار جلدوں میں شائع ہوئی ہے) اور قرآنی تشریحات اُن آیات میں جن کے حوالے مفہوم القرآن کی عبارات کے اندر (ساتھ ساتھ) دیئے گئے ہیں ۔ جب آپ اس کتاب میں بیان کردہ مفہوم کو لغات اور قرآن کے ساتھ ملا لیں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس میں کوئی بات اپنی طرف سے نہیں کہی گئی ۔ کتاب کے شروع میں ایک مبسوط مقدمہ ہوگا جس میں ان تمام اُمور کی وضاحت کی جائیگی ۔

بغرض سہولت، مفہوم القرآن کو مناسب حصوں میں شائع کیا جائے گا اور خریداروں کو ہر حصہ ساتھ کے ساتھ بھیجا جائے گا ۔ پوری کتاب بلاک میں چھپیگی اور کاغذ وھائٹ پرنٹنگ (سفید اور دبیز) ہوگا ۔ چونکہ اس کی طباعت سے پہلے یہ معلوم ہوجانا ضروری ہے کہ اس کے مستقل خریدار کسقدر ہیں (کیونکہ اس کی زائد کاپیاں چھاپنا مشکل ہوگا) اس لئے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے لئے کتاب کا نسخہ ریزرو ہوجائے تو آپ فہرست خریداران میں اپنا نام درج کرا لیجئے۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ آپ کچھ روپے (کم از کم دس روپے) بطور پیشگی جمع کرادیں ۔ اگر آپ ایسا کرینگے تو ہم ڈاک کا خرچ خود برداشت کرینگے اور آپ کو مفہوم القرآن کا ہر حصہ گھر بیٹھے، اصل قیمت پر مل جائیگا ۔ قیمت کا اندازہ پہلا حصہ چھپنے پر لگ سکیگا ۔

جن اصحاب کا نام پہلے ہی "پیشگی خریداران" کی فہرست میں شامل ہے، انہیں مفہوم القرآن کے لئے الگ روپے بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں مفہوم القرآن ساتھ کے ساتھ بھیجدیا جائیگا اور قیمت ان کے حساب میں محسوب ہوتی جائیگی ۔ والسلام

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ

۲۷۔بی۔شاہ عالم مارکیٹ۔لاہور

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃِ (۲)

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الٓمّٓ ① ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ ۛ فِیْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ② الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ
وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ③ وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ④ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ

---

① خدائے علیم و حکیم کا ارشاد ہے کہ

② تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو (۱) وہ ہمارے اِس ضابطۂ قوانین کے اندر محفوظ ہے (۲) جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے اور نہ کوئی نفسیاتی اُلجھن۔

یہ ضابطۂ قوانین، سفرِ زندگی میں، اُن لوگوں کو انسانیت کی منزلِ مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہیں۔

③ یہ وہ لوگ ہیں جو اُن حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں جو نگاہوں سے اوجھل ہیں، اور صحیح روش کے اُن نتائج پر بھروسہ رکھتے ہیں جو اگرچہ ابتداءً اُن کی نظروں سے پوشیدہ ہوتے ہیں لیکن جن کا آخرالامر سامنے آجانا یقینی ہوتا ہے۔

اِس مقصد کے لئے یہ لوگ اُس نظام کو قائم کرتے ہیں جس میں تمام اَفراد قوانینِ خداوندی کا اِتّباع کرتے جائیں۔ اور جو سامانِ نشو و نما اُنھیں دیا جاتا ہے، اُس میں سے اپنی ضروریات کے بقدر لے کر (باقی) نوعِ انسان کی پرورش کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

④ یہ وہ لوگ ہیں جو اُن تمام صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں جو (اے رسول!) تجھ پر بذریعہ وحی نازل کی گئی ہیں، اور جو تجھ سے پہلے پیغمبروں کو اُن کے اپنے اپنے وقت میں دی گئی تھیں (اور جو اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں) ——— اِن صداقتوں پر ایمان رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ وہ صحیح تاریخی شہادتوں سے اِس نتیجہ پر پہنچ جائیں کہ اِس پروگرام پر اِس سے پہلے بھی کئی بار عمل ہو چکا ہے اور اِس سے ہر بار وہی نتائج پیدا ہوئے ہیں جنکا اب وعدہ کیا جاتا ہے، اس لئے اب بھی وہی نتائج مرتب ہوں گے ——— وہ اِس طرح اِس حقیقت پر یقین رکھتے ہیں کہ اِس ضابطۂ خداوندی پر عمل کرنے سے ایک نئی زندگی کی نمود

الْمُفْلِحُونَ ۝۵ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ ءَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝۶ خَتَمَ

اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۝۷

ہو جاتی ہے اور یوں حال کی جدوجہد سے انسان کا مستقبل روشن ہو جاتا ہے — وہ مستقبل جس کا سلسلہ اسی دنیا تک محدود نہیں بلکہ وہ مرنے کے بعد بھی آگے چلتا ہے۔

۵ یہ وہ سعادت مند لوگ ہیں جو اپنے نشوونما دینے والے کے قانونِ ربوبیت کی راہ نمائی میں سفرِ زندگی طے کرتے جاتے ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی کھیتیاں آخرالامر پروان چڑھتی ہیں۔ ([illegible])

یہ گروہ اُن لوگوں کا ہے جو غلط روشِ زندگی کے تباہ کُن نتائج سے بچنا چاہتے ہیں اور اُن کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ صحیح راستہ اُن کے سامنے آجائے۔

۶ اِن کے برعکس، دوسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے کہ زندگی کا صحیح راستہ نمایاں طور پر اُن کے سامنے آجاتا ہے لیکن وہ ضد۔ حسد۔ تکبر۔ سرکشی اور اپنی مفاد پرستیوں کی بنا پر اُسے اختیار نہیں کرتے ([illegible])۔ وہ خود بھی اِس راستے پر نہیں چلتے اور دُوسروں کو بھی اِس پر چلنے سے روکتے ہیں۔ ([illegible])

اِن لوگوں کو اُن کی اِس رَوِش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے، اِن کے لئے برابر ہے۔ یہ صحیح راستہ کبھی اختیار نہیں کریں گے۔ (جو شخص خودکشی پر تُلا بیٹھا ہو اُس سے یہ کہنا کہ سنکھیا مُہلک ہوتا ہے، اِس سے بچنا، بے سُود ہوتا ہے)۔ ایسی نصیحت اُسی کے لئے نفع بخش ہو سکتی ہے جو زندہ رہنا چاہے۔ ([illegible])

۷ اِن لوگوں کی اِس رَوِش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اِن میں دیکھنے بھالنے اور سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی (جس طرح غصّے میں اِنسان پاگل ہو جاتا ہے)۔ اِن کی آنکھوں پر جذبات پرستی کے ایسے گہرے پردے پڑ جاتے ہیں کہ وُہ نشاناتِ راہ کو دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اِن کے کانوں میں ایسے ڈاٹ لگ جاتے ہیں کہ وہ آوازِ جرس سے بھی کارواں کا سُراغ نہیں پا سکتے۔ اِن کے قلب و دماغ پر اِس قسم کے غلاف چڑھ جاتے ہیں کہ وہ گردوپیش پر غور کرنے سے بھی صحیح سمت کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہ سب اِن کے اپنے اَعمال کا نتیجہ ہوتا ہے جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کے مُطابق مُرتّب ہوتا ہے ([illegible])

یہ لوگ اِس طرح اپنے آپ کو زندگی کی حقیقی شیرینیوں سے محروم کر لیتے ہیں اور تباہی و بربادی کے جہنم میں گر جاتے ہیں۔ کِس قدر اَلَم انگیز ہے اِن کا یہ انجام!

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝٨ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ
وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝٩ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝١٠ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝١١
اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝١٢ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا

---

۸ یہ دو گروہ تو وہ ہیں جو یا کھلے بندوں حقیقت کا اقرار کرتے ہیں یا کھلے بندوں اس سے انکار کرتے ہیں۔ تیسرا گروہ اُن لوگوں کا ہے جو زبان سے تو کہتے ہیں کہ ہم اِس ضابطۂ خداوندی کی صداقتوں پر یقین رکھتے ہیں اور قانون مکافات اور اُخروی زندگی پر ہمارا ایمان ہے' لیکن وہ درحقیقت اِن پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ لوگ یا تو سطحی جذبات پرست ہوتے ہیں اور یا ابن الوقت اور موقعہ پرست۔ اِس لئے اِن لوگوں کی رفاقت پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا)۔

۹ یہ لوگ نظامِ خداوندی اور اُس کے قائم کرنے والی جماعتِ مومنین سے دورُخی چالیں چلتے ہیں اور بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم انھیں فریب دے رہے ہیں' حالانکہ اگر یہ عقل و شعور سے کام لیتے تو اِن پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ وہ خود اپنے آپ کو فریب میں رکھ رہے ہیں۔

۱۰ اِس قسم کی جذبات پرستانہ اور فریب کارانہ زندگی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اِن کا قلب و دماغ صحت مندانہ توازن کھو بیٹھتا ہے۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ غیر متوازن ذہن جس قدر مصروفِ کار رہے گا اُسی قدر اُس کا توازن اور بگڑتا جائے گا۔
اِس رَوِش کو نبھانے کے لئے اِنہیں قدم قدم پر جھوٹ بولنا اور ہر موقعہ پر نیا بہروپ بدلنا پڑتا ہے۔ اندازہ لگاؤ کہ اِس سے اِن کی جان کس قدر اَلم انگیز عذاب میں رہتی ہے۔

۱۱ جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ ناہمواریاں پیدا کر کے معاشرہ کے نظام کو تباہ مت کرو' تو یہ نہایت ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ ہم معاشرہ کو بگاڑتے کب ہیں' ہم تو اِسے
۱۲ سنوارنے والے مُصلحین ہیں ——— یاد رکھو! یہی لوگ تباہ کاریاں اور ناہمواریاں پیدا کرنے والے ہیں۔ (اِس لئے کہ جن کی اپنی داخلی زندگی میں ہمواریاں نہ ہوں وہ معاشرہ میں کس طرح ہمواریاں پیدا کر سکتے ہیں!)

أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿١٣﴾ وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا
قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيَاطِينِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِئُونَ ﴿١٤﴾ اللَّهُ يَسْتَهْزِئُ
بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿١٥﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت
تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿١٦﴾

حیرت ہے کہ یہ لوگ اِس کا بھی اِحساس نہیں کرتے کہ اِن کے قول و فعل کا یہ تضاد، اِن کی اصل و حقیقت کو کس طرح بے نقاب کر دیتا ہے!

۱۳ جب اِن سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی اِس ضابطۂ زندگی کو اِسی طرح مانو اور اختیار کرو جس طرح جماعتِ مومنین کے افراد اِسے صحیح تسلیم کرتے اور اِس کے مطابق چلتے ہیں، تو یہ اِس کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ تو بے وقوف ہیں جنھیں اپنے نفع نقصان کا بھی خیال نہیں؛ اور مفت ہاتھ آجانے والے فائدوں کو چھوڑ کر "اُصول پرستی" کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں! کیا ہم بھی اِنہی جیسے احمق بن جائیں؟

یاد رکھو! نفع نقصان سے بے خبر اور احمق خود یہ لوگ ہیں جو اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتے کہ عارضی مفاد کی خاطر مستقل منافع کو چھوڑ دینا، اچھی تجارت نہیں کہلا سکتی۔

۱۴ اِن کی دو رُخی زندگی کا یہ عالم ہے کہ جب یہ اُن لوگوں کے سامنے آتے ہیں جو اِس ضابطۂ خداوندی کو اختیار کئے ہیں، تو اُن سے کہتے ہیں کہ ہم بھی تمھاری طرح اِسکی صداقت پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن جب یہ اپنی پارٹی کے سرغنوں سے تنہائی میں ملتے ہیں تو اُن سے کہتے ہیں کہ ہم اندر سے تو تمھارے ہی ساتھ ہیں، صرف ظاہرا طور پر اِن لوگوں سے ملتے اور انھیں بے وقوف بنا کر ان کا مذاق اُڑاتے رہتے ہیں۔

۱۵ اے کاش! یہ اِس کا اندازہ کر سکتے کہ یہ دوسروں کو بیوقوف بنا کر اُن کا مذاق کیا اُڑائیں گے، خدا کے قانونِ مکافات کی رُو سے (حقائق کی دُنیا میں) خود اپنا مذاق اُڑاتے ہیں۔ یہ لوگ، اپنی قوّت و اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر غلط راستے پر پڑ جاتے ہیں اور پھر حیران و سرگرداں مارے مارے پھرتے ہیں، اور جوں جوں آگے بڑھتے ہیں، منزل سے دُور ہوتے چلے جاتے ہیں۔

۱۶ یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا عقلمند سمجھتے ہیں کہ دوسروں کو دھوکا دے کر ناجائز فائدے حاصل کر رہے ہیں، اور خوش ہیں کہ ہمارا کاروبار بڑا نفع بخش ہے۔ حالانکہ

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ
لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَ
بَرْقٌ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ﴿١٩﴾

حقیقت یہ ہے کہ اِن جیسا نادان ہی کوئی نہیں کہ اِنہوں نے زندگی کی صحیح رَوِش کے بدلے میں غلط راستہ خرید لیا ہے۔ اِن کی یہ تجارت کبھی نفع بخش ثابت نہیں ہو سکتی۔ اِس لئے کہ یہ غلط راستے پر چل کر زندگی کی منزلِ مقصود تک کبھی نہیں پہنچ سکتے۔

۱۷ اِن عارضی اور عاجلہ مفاد کے پیچھے پھرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جنگل کی تاریک رات میں راستہ معلوم کرنے کے لئے آگ سُلگائے جس سے اُس کے اِرد گرد کی فضا روشن ہو جائے۔ لیکن اِس کے فوری بعد آگ بُجھ جائے اور اِس طرح خدا کا قانون اُسے تاریکیوں میں اِس طرح چھوڑ دے کہ اُسے کچھ دکھائی نہ دے۔ (یعنی مفادِ عاجلہ کی تابناکیاں ایک دفعہ تو نگاہوں میں چکاچوند پیدا کر دیتی ہیں لیکن اِس کے بعد ایسا اندھیرا چھا جاتا ہے کہ اِس میں) صرف نگاہیں ہی بیکار نہیں ہوتیں بلکہ سوجھ بوجھ کے تمام راستے مسدود ہو جاتے ہیں۔ اور انسان

۱۸ بہرا، گونگا اور اندھا ــ یعنی عقل و فکر سے عاری (۲۲/۲) اور جذبات سے مغلوب ہو کر نفع و نقصان کی تمیز سے محروم ہو جاتا ہے (۲/۲)۔ اور اُس کے لئے صحیح راستے کی طرف لوٹنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

۱۹ یا (اِن کے تمدنی اور معاشی نظام) کی مثال، جو اِن کے خود ساختہ قوانین سے مرتب ہوتا ہے، 'ایسی ہے جیسے' وقت پر مینہ برسانے والا بادل، لیکن اُس کے ساتھ گھٹا ٹوپ اندھیرا، گرج اور بجلی کی چمک بھی۔ (یعنی سامانِ زیست کے ساتھ اسبابِ ہلاکت ملے ہوئے (۲۲/۲)) یہ لوگ چاہتے ہیں کہ بارش کی منفعت بخشیوں سے تو فائدہ اُٹھا لیں لیکن رعد و برق کی تباہ کاریوں سے بچ جائیں۔ اس کا طریقہ اِن کی سمجھ میں یہ آتا ہے کہ کانوں میں اُنگلیاں ٹھونس لی جائیں ــــــ نہ یہ ہیبت ناک آوازیں سُنائی دیں، نہ وہ موت کے مُنہ میں جائیں ــــ اِن نادانوں کو اتنا معلوم نہیں کہ بجلی کی تباہ کاریاں کانوں کے راستے ہی اندر نہیں جایا کرتیں۔ وہ تو پوری کی پوری فضا میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔ (یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر تدبر کی فسوں سازی سے اُن رخنوں کو بند کر دیا جائے جن کے راستے اِن کی دانست میں، تباہیاں آتی ہیں تو غلط نظامِ زندگی کے

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ مَشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ
اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ ع ۲
الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿٢١﴾

عواقب سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ لیکن ان کا خیالِ خام ہے۔ خدا کا قانونِ مکافات اُس قوم کو چاروں طرف سے گھیرے رہتا ہے جو حقائق سے انکار کرتی ہے۔ (۶/۱۸۳ ؛ ۴۹/۵۴ ؛ ۹۵/۳۹ ؛ ۴۳/۱۹)۔

۲۰ ہوسکتا ہے کہ یہ لوگ کڑک کے ڈر سے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں (اور اس طرح بزعمِ خویش اپنے آپ کو اس خطرہ سے محفوظ خیال کرلیں)، تو بجلی کی چمک ان کی بینائی اُچک کر لے جائے۔ یعنی سامانِ زیست کی فراوانی ان کی نگاہوں میں ایسی خیرگی پیدا کر دے کہ ان کی آنکھیں خطرہ کے مقامات کو بھانپنے کے قابل ہی نہ رہیں، یا یہ ایک خطرہ کی روک تھام کا انتظام کریں تو دوسرا خطرہ کسی غیر متوقع مقام سے اُبھر کر انہیں تباہ کر دے (۱۶/۲۶)۔

مختصراً یوں سمجھو کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جو قوم بھی فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لے وہ اُن سے نفع یاب ہو جاتی ہے (۱۷/۲۰)۔ لیکن صرف طبیعی زندگی کے مفاد پر نگاہ رکھنے والوں کی یہ نفع یابیاں عارضی ہوتی ہیں؛ اور بلند اقدار کو سامنے رکھنے والوں کی مستقل اور پائیدار۔ (۱۴/۲۴ ؛ ۱۱/۵ ؛ ۲۴/۳۵)۔ اول الذکر کی حالت یوں سمجھو جیسے کوئی شخص بادلوں سے گھری ہوئی تاریک رات میں صحرا میں راہ گم کردہ کھڑا ہو۔ جب بجلی کی چمک سے ذرا راستہ روشن ہو جائے تو وہ اُس میں چار قدم چل لے، لیکن جب پھر اندھیرا چھا جائے تو کھڑے کا کھڑا رہ جائے۔

ہم چاہتے تو ایسا بھی کر سکتے تھے کہ ان لوگوں کے ذرائع علم (سماعت و بصارت) سلب ہو جاتے اور اس طرح انہیں قدرتی سامانِ نشوونما سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ہی نہ دیا جاتا۔ لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ ہم نے ہر بات کیلئے اندازے اور پیمانے مقرر کر دیئے، اور قوانین و ضوابط ٹھیرا دیئے ہیں۔ کائنات کی کوئی شے ان پیمانوں سے باہر نہیں جا سکتی۔ ان پر ہمارا پورا پورا کنٹرول ہے۔

۲۱ لہٰذا، اے گروہِ نسلِ انسانی! تمہیں ان اقوام کے خود ساختہ نظام کی نگاہ فریب جگمگاہٹ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیئے۔ تمہیں چاہیئے کہ اپنے آپ کو اپنے نشوونما دینے والے کے قوانین کے تابع لے آؤ۔ وہ نشوونما دینے والا جس نے تمہیں اور تمہارے

الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۲۳﴾

آباد اجداد کو پیدا کیا' اور کائنات کی اس قدر تخریبی قوتوں کے باوجود' نسلِ انسانی کو مختلف مراحل میں سے گذارتے ہوئے اس مقام تک لے آیا (۲/۲۱)۔ بس یہی ایک طریق ہے جس سے تم راستے کے خطرات سے محفوظ رہ سکو گے۔

۲۲ یہ حفاظت تمہیں خدا کے عالمگیر نظامِ ربوبیت کی رُو سے مل سکے گی جس کے مطابق اُس نے تمہارے لئے زمین میں ٹھکانے کا سامان پیدا کر دیا۔ اُوپر فضا میں کُرّے بکھیر دیئے تاکہ باہمی کشش و جذب سے یہ اپنی اپنی جگہ برقرار رہیں۔ پھر ایسا انتظام کر دیا کہ آسمان سے پانی برسے جس سے تمہارے لئے سامانِ رزق پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام سامانِ زیست تمہیں خدا کی طرف سے بلا مزد و معاوضہ ملا ہے۔ اس پر ملکیت خدا ہی کی ہے' تمہیں صرف اس کے استعمال کی اجازت دی گئی ہے۔ لہٰذا تم نے ایسا نہ کرنا کہ انسانوں کو اس کا مالک بنا دو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ 'جانتے بوجھتے' خدا کے ساتھ شرک ہو گا۔

۲۳ اگر تم اس قدر محکم دلائل و شواہد کے باوجود' اس باب میں کسی شک و شبہ یا نفسیاتی اُلجھن میں مُبتلا ہو کہ جو ضابطۂ زندگی ہم نے' اپنے بندے کی وساطت سے تمہیں دیا ہے' وہ واقعی حقیقت پر مبنی ہے یا نہیں' تو اس کے دُور کرنے کی آسان ترکیب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جو نقشہ یہ ضابطہ پیش کرتا ہے' اُس کے بجائے کوئی متبادل نقشہ تم مُرتّب کر کے دکھاؤ ——— پُوری کی پوری عمارت کا نہیں تو اس کی کسی ایک منزل ہی کا سہی ——— یعنی اس ضابطہ کی کسی ایک شق جیسی شق بنا کر لاؤ۔ (۱۰/۳۸ ؛ ۱۱/۱۳) - اس کے لئے کسی ایک شخص پر ذمہ داری ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ جتنے ادیب و مفکر اور تمدّنی اور سیاسی مقنّن تمہارے معاشرہ میں پائے جاتے ہوں' ان سب کی ایک کمیٹی بنا لو' بس ایک اللہ کی وحی کو الگ چھوڑ دو' اور ان سے کہو کہ ایسا کر کے دکھائیں۔ اگر تم واقعی اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ تم اس کا فیصلہ نہیں کر پاتے کہ یہ ضابطہ خدا کی طرف سے ہے یا نہیں' اور محض اپنی مفاد پرستیوں سے چمٹے رہنے کی خاطر شکوک و شبہات کا ساز نہیں بجا رہے'

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾
وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ
رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِیْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

تو تمھیں اس چیلنج کو ضرور قبول کر لینا چاہئے۔

۲۴ لیکن اگر تم نے ہمارے چیلنج کو قبول نہ کیا ——— اور ہم بتائے دیتے ہیں کہ تم اسے ہرگز قبول نہیں کرو گے ——— اور عقل و بصیرت کی رو سے بات سمجھنے کی کوشش نہ کی بلکہ اپنی مخالفت میں اندھا دھند آگے بڑھتے گئے اور حق کے راستے میں روک بن کر کھڑے ہو گئے' تو اس کا نتیجہ وہ تباہی و بربادی کا جہنم ہو گا جس میں تمھارے عوام اور خواص' اور چالاک لیڈر اور ان کے متبعین' سب اپنی دولت و حشمت کے ساتھ' جا گریں گے۔ ——— خواہ یہ جنگ کی صورت میں ہو' جس کی آگ انسانوں کے ہاتھوں سے اور حدنی آلاتِ حرب و ضرب کے ذریعے بھڑکائی جاتی ہے۔ اور خواہ غلط نظام زندگی کے تباہ کُن انجام کی شکل میں ہو۔ بہر حال' یہ وہ جہنم ہے جو صحیح ضابطۂ زندگی سے انکار اور سرکشی برتنے والوں کے اعمال نے ان کے لئے تیار کر رکھا ہے۔

۲۵ اس ٹکراؤ میں اُس جماعت کے لئے گھبرانے کی کوئی بات نہیں جو قوانینِ خداوندی اور زندگی کی بلند اقدار کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے' اور خدا کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا رہتی ہے۔ اے رسول! تو انھیں خوشخبری دیدے کہ اِن کے لئے ایک ایسا معاشرہ متشکل ہو جائے گا جس کی شادابیاں سدا بہار' اور جس کی آسائشیں زوال نا آشنا ہوں گی (۴۷/۱۵)۔ اِس زندگی میں بھی خزاں نادیدہ بہاریں' اور بعد کی زندگی میں بھی حیاتِ جاوید۔

یہ چیزیں صرف اِنہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ جب اور جہاں بھی کسی جماعت نے ایسی روش اختیار کی اُس کا یہی نتیجہ نکلا (۲۴/۵۵ : ۳۹/۳)۔ اِن اعمال کے نتائج ہمیشہ ایک جیسے ہوتے ہیں' البتہ اِن کے پیکر زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ملتے جلتے ہیں۔

اِس معاشرہ میں اِن کے ساتھ اور لوگ بھی ملتے جائیں گے اور اِن کے رفیق بنتے جائیں گے۔ یہ بھی اِن ہی جیسی پاکیزہ سیرتوں کے حامل ہوں گے۔ جب تک

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ
وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ
وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ
اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

یہ معاشرہ قوانین خداوندی کی بنیادوں پر استوار رہے گا' یہ اپنے پھل اسی طرح دیتا جائے گا۔ اس میں فساد اور تغیر واقع نہیں ہوگا۔

۲۶ ہم نے اس معاشرہ کو ایک سرسبز و شاداب باغ (جنت) کہہ کر پکارا ہے' اور اور ان کے اعمال حسنہ کے نتائج کو لذیذ پھلوں سے تشبیہ دی ہے' تو اس لئے کہ بلند حقیقتیں، محسوس تشبیہات سے سمجھائی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا یہ بات شانِ خداوندی کے منافی نہیں کہ وہ حقائق کو تمثیلات کے ذریعے بیان کرتا ہے۔ یہ تو خیر پھر بھی باغات اور پھلوں کی مثالیں ہیں' اگر ضرورت پیش آئے تو اسے اس میں بھی کسی قسم کا باک نہیں ہوگا کہ وہ مچھر جیسی حقیر شے' یا اس سے بھی کسی کمتر چیز کی مثال دے کر بات واضح کر دے۔ جو لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ یہ سب کچھ خدا کی طرف سے (وحی کے ذریعے) بیان ہو رہا ہے' وہ ان مثالوں سے سمجھ جائینگے کہ یہ' اُن کے نشو و نما دینے والے کی طرف سے حقیقتِ ثابتہ ہے۔ لیکن جو لوگ اس بنیادی حقیقت ہی سے انکار کرتے ہیں وہ ان تمثیلات اور تشبیہات میں بھی ہزار نقص نکالیں گے اور کہیں گے کہ اس قسم کی مثالوں سے بالآخر مقصد کیا ہے؟ اس سے تم سمجھ لو کہ ایک ہی بات سے کس طرح دو متضاد نتیجے اخذ کئے جا سکتے ہیں' فرق زاویۂ نگاہ کا ہوتا ہے۔ ایک انداز نگاہ سے دیکھو تو اسی سے گمراہی کے راستوں پر جا پڑو۔ اور دوسری نگاہ سے دیکھو تو اسی سے کامیابیوں اور کامرانیوں کی راہیں کشادہ ہو جائیں۔ لیکن غلط راہوں پر صرف وہ لوگ چل نکلتے ہیں جو قوانین خداوندی کے قالب کے اندر زندگی بسر کرنا نہیں چاہتے' بلکہ ان سے گریز کی راہیں نکال کر اپنے لئے الگ راستے اختیار کر لیتے ہیں۔

۲۷ یہ وہ لوگ ہیں جو اُن تمام ذمہ داریوں کے قبالہ کو ریزہ ریزہ کر ڈالتے ہیں جو اُن پر خدا کی ربوبیتِ عالمینی کی رُو سے عائد ہوتی ہیں' نیز اُس عہد کو بھی توڑ ڈالتے ہیں جو انھوں نے نظامِ خداوندی سے باندھا تھا (۷/۱۷۲) - اور اس طرح' انسانیت کے تمام رشتوں کو منقطع کر کے (۱۳/۲۵ ؛ ۴۷/۲۲) انفرادی مفاد پرستی کو زندگی کا نصب العین

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٢٨﴾
هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ
بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾

بنا لیتے ہیں' حالانکہ خدا کے قانونِ ربوبیّت کا تقاضا ہے کہ اِن رشتوں کو توڑ کر' تمام نوعِ انسان کو ایک برادری کے افراد اور ایک درخت کی شاخیں سمجھا جائے ([illegible]) - اِس روش کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ میں ناہمواریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور آخرالامر تباہی اور بربادی کے سوا اِن کے حصّے میں کچھ نہیں آتا۔

۲۸ اِن لوگوں سے (جن کی روشِ زندگی کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) کہو کہ تم قانونِ خداوندی کا اِنکار کس دلیل سے کر سکتے ہو' جبکہ خود تمھاری اپنی ہستی اِس کی زندہ شہادت ہے۔ تم کسی انداز سے بھی غور کرو' اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک وقت ایسا تھا کہ تم زندگی سے محروم تھے۔ (زندگی تو ایک طرف' تم کوئی قابلِ ذکر شے ہی نہیں تھے۔ ([illegible]) - پھر تم میں زندگی آگئی- ظاہر ہے کہ زندگی تمھاری پیدا کردہ نہیں' اِسے خدا ہی نے عطا کیا ہے۔ اِس کے بعد جب تم طبیعی قانونِ خداوندی کے مطابق مر جاؤ گے تو خدا کیلئے کونسی مشکل ہوگی کہ تمھیں پھر زندہ نہ کر سکے ([illegible]) - لہٰذا' موت سے زندگی کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ زندگی آگے چلتی ہے' اور آگے چلتی ہے مکافاتِ عمل کیلئے۔ اِس لئے تم اِس قانون کی گرفت سے باہر جا ہی نہیں سکتے۔ تم اِس سے ہزار بھاگنے کی کوشش کرو' تمھیں آخرالامر اِس کی طرف لوٹ کر آنا ہوگا —— بلکہ یوں سمجھو کہ اب بھی تمھارا ہر قدم اِسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔

۲۹ یہ قانون اُس خدا کا متعین کردہ ہے جس نے تمھیں اِس زمین پہ پیدا کیا تو تمھارے لئے سامانِ نشو و نما بھی ساتھ ہی مہیا کر دیا- پھر تم کائنات کی پہنائیوں میں غور کرو کہ اُس میں متعدد اجرامِ فلکی کس توازن و اعتدال کے ساتھ اپنے اپنے فرائض کی سرانجامدہی میں سرگرمِ عمل ہیں ([illegible]) - یہ بھی خدا ہی کے قانون کے مطابق ہو رہا ہے۔ اُس خدا کے قانون کے مطابق جو ہر شے کی مضمر قوتوں اور تقاضوں سے اچھی طرح باخبر ہے۔

ارض و سما کا یہ کائناتی نظام اِس لئے سرگرمِ عمل ہے کہ انسانوں کے اعمال کے ٹھیک ٹھیک نتائج مرتب ہوں ([illegible]) - اِس حقیقت کے سمجھنے کے لئے

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّى جَاعِلٌ فِى ٱلْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا۟ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا
وَيَسْفِكُ ٱلدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّىٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾ وَعَلَّمَ
ءَادَمَ ٱلْأَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى ٱلْمَلَٰٓئِكَةِ فَقَالَ أَنۢبِـُٔونِى بِأَسْمَآءِ هَٰٓؤُلَآءِ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٣١﴾

ضروری ہے کہ پہلے انسانی خصوصیات اور کائنات میں اس کے مقام کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اسے قصۂ آدم کے تمثیلی انداز میں بیان کیا جاتا ہے، جو درحقیقت خود انسان ہی کی سرگذشت ہے۔

۳۰ جب زندگی اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی[1] پیکرِ انسانی میں پہنچی، اور مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آیا کہ انسان، اپنے سے پہلی آبادیوں کی جگہ زمین میں آباد ہو (۶/۱۶۵)، تو کائناتی قوتوں کو اس پر تعجب ہوا۔ اس لئے کہ اس سے پہلے کائنات میں کوئی ایسی مخلوق نہیں تھی جسے قوانینِ خداوندی سے مجالِ سرتابی ہو (۱۶/۴۹-۵۰)۔ لیکن اس جدید مخلوق کو صاحبِ اختیار و ارادہ بنایا جا رہا تھا، جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی بھی کرسکتا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے عرض کیا کہ بار الٰہا! یہ کس قسم کی مخلوق ہے جسے اب زمین میں بسایا جا رہا ہے؟ یہ تیرے قانون سے سرکشی برتے گا جس کا نتیجہ ناہمواریاں اور خوں ریزیاں ہوگا۔ اس کے برخلاف ہم ہیں کہ جو فرائض ہمارے سپرد کئے گئے ہیں ہم اُن کی سرانجام دہی میں ہمیشہ سرگرمِ عمل رہتے ہیں اور تیرے پروگراموں کو وجہِ حمد و ستائش بنانے کے لئے جہاں تک جانا پڑے جاتے ہیں۔ اس پر خالقِ کائنات نے کہا کہ ہمارے اس جدید پروگرام کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہم یہ سب کچھ جانتے ہیں۔

۳۱ انسان میں اس امر کی امکانی استعداد رکھ دی گئی تھی کہ یہ اُن قوانین کا علم حاصل کرسکے جن کے مطابق مختلف اشیائے کائنات سرگرمِ عمل ہیں۔ چنانچہ اُن کائناتی قوتوں سے کہا گیا کہ اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ یہ جدید مخلوق تمہارے مقابلہ میں فروتر ہے، تو بتاؤ کیا تمھیں بھی یہ استعداد حاصل ہے؟

---

[1] انسانی زندگی کے ارتقائی منازل کے لئے حسب ذیل آیات دیکھئے۔

۶/۲ ؛ ۷/۱۸۹ ؛ ۲۲/۵ ؛ ۲۳/۱۲-۱۴ ؛ ۴۰/۶۷ ؛ ۳۲/۷-۹ ؛ ۳۵/۱۱ ؛ ۳۶/۱۱ ؛ ۷۱/۱۴

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ
بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ
مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى وَ
اسْتَكْبَرَ ٭ۗ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ ﴿۳۴﴾ وَ قُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ۪
وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۵﴾

۳۲ اِس پر اُنھوں نے عجز سے اپنی گردن جھکا دی اور کہا کہ تیرے پروگرام ہماری حدِ نگاہ سے بہت آگے ہوتے ہیں۔ ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا ہمیں علم دیا گیا ہے۔ اِس سے زیادہ اکتسابًا کچھ معلوم کر لینے کی ہم میں استعداد ہی نہیں۔ تجھے کائنات کا کُلّی علم ہے اور تو ہی اپنے پروگرام کی غرض و غایت سے باخبر ہے۔

۳۳ جب اِس طرح انسانی ممکنات کی یہ پہلی جھلک اُن کے سامنے آگئی تو اُن سے کہا گیا کہ ہم کائنات اور اِس میں پیدا کی جانے والی مخلوق کے متعلق وہ کچھ جانتے ہیں جو تمھاری نگاہوں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ تم سے منبردست کیا کچھ ظہور میں آ رہا ہے اور تمھاری مضمر صلاحیتیں کیا ہیں (جن کی نمود انسان کے ہاتھوں ہوگی)۔

۳۴ اس پر کائناتی قوتیں سب انسان کے سامنے جھک گئیں، لیکن ایک چیز ایسی بھی تھی جس نے اِس کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے سرکشی اختیار کی۔ یہ تھے انسان کے خود اپنے جذبات جن کے غالب آجانے سے اس کی عقل و فکر ماؤف ہو جاتی ہے اور اتنی بڑی قوتوں کا مالک، خود اپنے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے، اور ہر چار طرف سے مایوسیاں چھا جاتی ہیں۔

۳۵ اِن صلاحیتوں کے ساتھ انسان کو دُنیا میں بسایا گیا۔ اِس کی ابتدائی زندگی کا نقشہ یہ تھا کہ ابھی ضروریات بہت محدود تھیں اور سامانِ نشو و نما کی بڑی فراوانی تھی۔ ([illegible])۔ اِس لئے اِن میں نہ باہمی تصادم تھا، نہ تزاحم۔ نہ اختلاف تھا، نہ افتراق۔ تمام انسان ایک برادری کی طرح رہتے تھے ([illegible])۔ چنانچہ اِن سے کہہ دیا گیا کہ اگر تم نے باہمی اختلافات شروع کر دیئے تو یہ جنتی زندگی تم سے چھن جائے گی اور تم (زندگی کے بلند مقاصد کو ایک طرف) سامانِ زیست کے حصول کیلئے بھی جانکاہ مشقتوں میں مبتلا ہو جاؤ گے ([illegible])، اور اِس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے آپ پر زیادتی کر بیٹھو گے۔

فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَأَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيهِ ۖ وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۖ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ
مُسْتَقَرٌّ وَمَتَاعٌ إِلٰى حِينٍ ﴿٣٦﴾ فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ﴿٣٧﴾
قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۖ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٣٨﴾
وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيٰتِنَا أُولٰٓئِكَ أَصْحٰبُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿٣٩﴾

۳۶ لیکن انسان پر اُس کی انفرادی مفاد پرستیوں کے جذبات غالب آگئے اور اس نے اپنے خود ساختہ نظام کے مُطابق تمدّنی زندگی بسر کرنی شروع کردی۔ اس سے اسکی وہ جنتی زندگی چھن گئی۔ انسان مختلف گروہوں میں بٹ گیا' اور ایک گروہ دوسرے گروہ کا دشمن ہوگیا۔ ان میں مفاد خویش کی پیچیدگیاں حائل ہوگئیں۔

لیکن دُنیا میں انسانی زندگی کوئی ایک آدھ دن کی بات نہ تھی کہ یوں بھی گذر ہوجاتا۔ اس نے یہاں ایک مدت تک رہنا اور سامان زیست سے ہر ایک نے فائدہ اٹھانا تھا۔ تو کیا انسان کیلئے اُسکی خود پیدا کردہ مصیبت کا کوئی حل نہیں تھا؟

۳۷ اس کا حل تو تھا لیکن یہ' اُس کے عقل کے بس کی بات نہیں تھی۔ عقل انسانی ہر فرد کو اُس کے مفاد کے تحفظ کی راہیں تو بتا سکتی ہے 'عالمگیر انسانیت کے امن و سلامتی کا طریق نہیں بتا سکتی۔ یہ اُس نظریۂ زندگی اور نظام حیات کی رو سے ممکن تھا جو خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملنا تھا' اور جسے اختیار کرنے سے اسے پھر سے وہی جنتی زندگی حاصل ہو سکتی تھی۔

۳۸ چنانچہ جب وہ جنت کی زندگی اس سے چھن گئی تو اس سے کہدیا گیا کہ تمہارے لئے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں — خواہ تم سب کے سب غلط راستے پر چل نکلو پھر بھی مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ہماری طرف سے' ہمارے رسولوں کی معرفت (ﷺ) تمہاری طرف راہ نمائی آتی رہے گی۔ جو لوگ اُس راہ نمائی کے مُطابق زندگی بسر کریں گے وہ ہر قسم کے خوف و حزن سے محفوظ رہیں گے

۳۹ لیکن جو لوگ اس راہ نمائی کے قبول کرنے سے انکار کریں گے اور اس کی صداقتوں کو جھٹلائیں گے' تو ہمارے قانون مکافات کے مطابق وہ مستقل عذاب کی زندگی جئیں گے —
— اس دنیا میں بھی اور اس کے بعد بھی —

کائناتی قوتوں کو مسخر کرلینا مقام آدم ہے (یعنی کائنات میں انسان کا صحیح مقام) اور ان قوتوں کو وحیٔ خداوندی کے مُطابق' عالمگیر انسانیت کی بہبود کی خاطر استعمال کرنا' مقام مومن ہے۔ اگر ان قوتوں کو مختلف قومیں اپنی خواہشات اور ذاتی مفاد کیلئے استعمال کریں تو اسکا نتیجہ عالمگیر فساد ہو

یہ ہے سرگذشت آدم کا تمثیلی بیان اور اس کا ماحصل۔

مفہوم القرآن

کے چند صفحات بطور نمونہ آپ کے سامنے آگئے۔

اس کتاب میں، پورے کے پورے قرآن کریم کے مطالب اسی انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ ساری کتاب اس نمونہ کے مطابق بلاکوں پر چھاپی جائے گی۔

کتاب، بالاقساط، مناسب حصوں میں، شائع کی جائیگی، اور ہر حصہ خریداروں کو ساتھ کے ساتھ بھیجدیا جائے گا۔ اگر آپ اسے حاصل کرنا چاہتے ہیں، تو کم از کم دس روپے بمد پیشگی ارسال فرما دیجئے۔ ہر حصہ آپ کو (خرچ ڈاک کے بغیر) بھیج دیا جائے گا اور اس کی قیمت آپ کے زرِ پیشگی سے وضع کر لی جائے گی۔

والسلام

میزان پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۲۷ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

طبع کردہ:
میزان پرنٹنگ پریس
۲۷ - بی - شاہ عالم مارکیٹ - لاہور

with sex alone. All other attributes are denied her. The fact that a man cannot talk to a woman as he does to another man is the result of this attitude. Indeed ! there could be no deeper humiliation than to be made to personify something that has already been stigmatised and condemned. I am convinced that as long as sex is considered dirty and sinful, a woman will never be respected. Man has shown respect only to those women with whom he cannot have sexual relationship. These women are his mother, his sister and his daughters.

These are the hard and unpleasant facts that we must face. There is no escape from them. A woman is born a woman, and she has to die a woman. Birth is the determining factor. A Shudra might one day be born a Brahman even after 34 crores of births and rebirths. But "all the king's horses and all the king's men" cannot change a woman into a man.

Here is a challenge of the "woman's Question? This challeuge can be met by the Quran alone. It is only the Quranic social order that guarantees the fulfillment of the basic needs of every individual. It leaves no scope for one man to dominate another simply because he is in a position to fling to him a morsel of food. Each individual gets his requirements as a matter of right and not on the chance emotional bouts of charity and favour of a philanthropist. The future of the woman therefore lies in the Quranic Nizam-i-Rabubiat, for to be secure is to be free.

Further more, the Quran breaks down one by one the citadels of man made religion by proclaiming to the world that there is absolutely no different between a man and a woman with the exception of the different biological function of reproduction. It is ridiculous to allocate exclusive characteristics to men and women on the basis of this biological difference. There are no such things as masculine tastes and feminine tastes, masculine habits and feminie habits, masculine interests and feminine interests, masculine talents and feminine talents, ete. etc.

And above all, the Quran has wrought a fundamental revolution in the attitude of mind towords sex. All the taboos and stigmas have been ripped of it and it is reinstated to its proper status. The woman is no longer an object for the gratification of man's lust but complementary to him.

Such are the Quranic values. Considering what the woman has lundergone in the past, and is undergoing today, she has an extra responsibility for her own sake to leave no stone unturned to establish the Quranic social order, for in this social order lies her hope and and her future.

was a easily obtained. The custodians of the man-made religious, declared that obedience to the king's will is obedience to God, and that woman, being the cause of Adam's banishment from paradise, is the source of all evil. The question of reforming and inproving her does not arise, because being born of Adam's ribs she will break if attempt is made to straighten her. The woman's bondage thus received a religious sanction. The idea of her being inferior became sacred, and as such it could not be touched. Furthermore, this sacrosanct character made its way into secular literature, where in the form of idioms and proverbs, it gained ground in the minds of the people. Without any hesitation and any qualms we today talk about educated women being "intellectual monstrosities, of her being "sweatly unreasonable", and we believe that "women should never be trusted", for "Frailty-thy name is woman".

The impact of this centuries old experience and development has convinced woman herself that she is inferior to man. Indeed, it is this conviction of hers that constitutes the biggest hurdle in her emancipation.

Ladies and gentlemen—bear patiently with me, for the end is not yet! Even if we do manage to secure economic security for the woman and prove to the people rationally that she is not inferior to man, it will not completly solve the "Woman's Question," for after all said and done, she is still a woman.

Unfortunately, in the course of the development of its culture and civilisation, mankind evolved unhealthy and unnatural notions about sex. The origin of this development can be traced to the ancient times, when the realisation that God has no parents and no children, that He was neither begotten nor does He beget, led the people erroniously to the conclusion that perfection and goodness is devoid of sex. This idea reached its culminating point in Christianity. The theory of Immaculate Conception, the virgin birth of Jesus, and the unmarried life that Jesus led, all proclaim the sinfulness and evil of sex. And then wasn'it Eve who at the instigation of Satan tempted Adam to partake of the forbidden fruit so that they could achieve immortality through there offsprings? Consequently, every child is born with the original sin, and faith in the "purity" of Jesus alone can wash it away, and the ideal man is he who can escape the woman—the temptress.

One by-product of this attitude is that the woman has came to be associated

[ii]

From the obove we deduce that one factor in the subjugation of women is economic dependence on man. This factor becomes clear and understandable when we analyse the background of the two types of tribal organisations-matriarchal and patriarchal. There have been instances when a really healthy woman did not feel the necessity of confinement. Before and after the birth of her child, she continued to work along with the menfolk. Secondlly, in some areas of the world, struggle for existance has been comparatively easier, so much so, that women have been able to share equally with men their economic pursuits. These places have witnessed the birth of matriarchal societies. But the places where these factors have been non-existent, emerged the patriarchal form of society. Of course, the patriarchal societies have been found in a majority, but the very fact that a few matriachal tribes did exist, proves beyond doubt that once the economic dependence is removed, woman has a better chance of realising her womanhood, and she can live as she ought to live. This is true not only of relationship between men and women, but also between men and men. Those who have monopoly over wealth, be they feudal lords, or capitalists or big business, have invariably exploited those who depend on them economically. The feudal lord exploits the toiling farmers, the capitalist his famished workers, the master in the house dominates the domestic servant, the boss bullies his immediate subordinate, the wealthy nations crush and repress the backward and poor nations, and-man subjugates the woman. The kings too found in this economic factor a masterplan to maintain their kingship. All that they had to do was to reduce the common man to poverty, and thus make him busy in eking out his living.

It is interesting to note here that in this economic struggle and the emergence of the rich and poor classes, women become in the economic terminology, a class by themselves.

However, the story does not end there. Having once enjoyed power to command and domineer, neither the ruller of the ruled, nor man, the master of the woman, cares to give it up. If only the position of the patriarch, the king and the man, gained through economice control, be justified, they could rule for ever. The justification

Causes of Woman's Subjugation

Prof. MISS SHAMIM ANWAR, (Kanaired College, Lahore)

[*Speech delivered at Tolu-e-Islam Convention on 8-4-1951*]

This afternoon, Ladies and gentlemen, I shall place before you some very practical prepositions regarding this eternal, (what I choose to describe as the) "Woman's Question." The subjugation of women has been the theme of many a book, and the fact that women even today are merely a dim travesty of what they might be, is now universally recognised. What provokes my curiosity is as to when, how and why women became subjugated. What are those factors that have created and perpetuated a margin between the potential development of her personality and individuality and her actual animal existence? Why has the woman not been able to cross this margin? This is the question that has always worried me. What ever I have learnt and discovered so far, I shall attempt to present before this august assemblage most humbly, but frankly and uninhibitedly.

Woman, by virtue of being the female sex, has been bestowed upon by Nature an important biological funtion-namely, the perpetuation of the human race. In this role she inevitably becomes incapacitated for a considerable period of time. This incapacity means that she has to depend upon someone for her self-preservation, someone who is never incapacitated and disabled as she is. This someone, in the Nature's scheme af things is the man. It is to this man that the woman has to look up to for her daily bread, a garment to cover herself, and a roof on her head. To be dependent in this manner is to be absolutely helpless, to be helpless is to he exploited. For sheer-self preservation and above all, the preservation of her children, the woman suffered it all, until this relationship of dependence and dominance became a universal and a rigid pattern. In the course of time this pattern came to be looked upon as a very "normal", and "natural" one, for man seems to be so constituted that if anything is practised by the majority and practised for a long time, it is regarded as the right thing, and any opposition to it is "abnormal", "unnatural" and of course "wrong".